عدل اور جزاء

نایاب جیلانی

نایاب جیلانی

عدل اور خراج

روشنی کی منی سی لکیر ایک نکتے پر ٹھہر گئی تھی۔ جیسے وہاں سے نہ ہٹے گی نہ آگے بڑھے گی۔ روشنی کی منی سی یہ لکیر آنکھ کے اندھیرے دور کرنے کے لیے آئی تھی۔ آنکھ کی پتلیوں پہ تنے جالے ہٹانے اور منظر واضح کرکے بہت کچھ سامنے لانے اور سچائیاں دکھانے کے لیے آئی تھی۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ دیکھے گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ کیا منوانا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے کچھ سمجھ نہ پایا۔ حالانکہ وہ ایک کھلی کتاب اس کے سامنے رکھ چکی تھی تاہم اس نے کتاب کے فٹ نوٹ پہ سیاہی مل دی تھی تاکہ کتاب کا شرح یا حوالہ جو متن کے نیچے لکھا تھا' وہ اس کی نظر نہ پڑھ لے۔ اس کے انداز کچھ ایسے ہی تھے اور یہ کتاب بھلا کیسی تھی؟ کسی مصنف کے ہاتھ سے لکھی داستان نہیں بلکہ کسی کی زندگی کے ساتھ کھیلی گئی ہار اور جیت کی بازی' ایک فتح نامہ' جو شکست خوردہ تھا۔ اس کے دل میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ بنا پلکیں جھپکے اس کے تاثرات دیکھتا گیا۔

"ولید نے فون پہ جو کہا' ٹھیک کہا۔۔۔ تم مان کیوں نہیں جاتے۔ اس میں حرج کیا ہے؟ جب میں رضامند ہوں۔" وہ فائل بک میں کچھ کاغذات ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد بہت پرسکون تھی۔ وہ اپنی بیوی کی خواہش جان کر متحیر تھا۔ کیا کوئی ایسا بھی کہہ سکتا

مکمل ناول

ہے؟

"تم۔۔۔ پاگل ہو چکی ہو۔ اس حادثے نے تمہارا دماغ بھی متاثر کیا ہے۔ تم بہکی بہکی باتیں کیوں کرتی ہو یا پھر ایثار کرنے کا جنون سوار کرلیا ہے۔" وہ بدک کر چیخ پڑا تھا۔

"کون ایثار کر رہا ہے؟ یہ تو محض کفارا ہے۔" اس کی بیوی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ اس کے الفاظ بہت شکستہ تھے جیسے وہ خود شکستہ تھی اداس ویران اور اجاڑ تھی وہ اپنی محبوب بیوی کی اداسی اور ویرانی پہ تڑپ گیا تھا۔

"تم مان جاؤ۔۔۔ تاکہ میرے دل پہ لدا بوجھ ہلکا ہو۔" اس کی بیوی اب گڑگڑانے لگی تھی۔ پھر اونچی آواز میں رونے لگی۔ آنسو بہت بڑا ہتھیار تھے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارے دل پہ کیوں بوجھ ہے؟" وہ کچھ نہیں جانتا تھا کیوں کہ روشنی کی لکیر اس کی آنکھ میں ابھی نہیں اتری تھی۔ روشنی کی لکیر جب آنکھ کی پتلیوں کے جالے ہٹا دیتی تب کیا ہوتا؟

وہ دونوں صرف یہی بات سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بیوی ہر منظر واضح ہونے سے پہلے بند باندھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے قدم، سوچ اور ذہن کو زنجیر کردینا چاہتی تھی۔ وہ تھوڑی نہیں، بہت مفاد پرست تھی۔ اپنے "فائدے" کو دیکھ کر کوئی بھی فیصلہ کرلیتی، مگر اس دفعہ یہ فائدہ اور فیصلہ بھونچال لانے والا تھا۔

"یہ سوال مت پوچھو۔۔۔" وہ سسک اٹھی۔ اسے خود کو مظلوم ثابت کرنا تھا اور اس کے آنسو ایک ہتھیار کا کام دیتے تھے۔

"اور تم مجھے مجبور مت کرو۔" وہ بگڑ گیا روشنی کی لکیر بھی بگڑ گئی۔

"تمہارے کسی کام کی نہیں ہوں۔ مجھے تمہارا احساس ہے۔" وہ اسے قائل کرنا چاہتی تھی۔

"میں نے تم سے گلہ نہیں کیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تب تم کیا کرتیں؟" اس نے اصولی سوال کیا۔

"مجھے دلیلوں میں مت الجھاؤ۔ بس فیصلہ کرو۔" اس کی جان جیسے اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اسے ہر صورت منا لینا چاہتی تھی۔ پر یہ ممکن تھا؟

"مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔" اس کے ارادے اٹل تھے۔ روشنی کی لکیر اس سے کچھ دور ہوئی۔

"تم میری خواہش پوری نہیں کرسکتے؟" وہ تڑپ اٹھی۔

"نہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نظر فائل بک پہ اٹک گئی۔ پاکستان سے آئی ڈاک تھی۔ لفافے پہ مہریں وہیں کی تھیں وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ کچھ حیران ہوا۔ روشنی کی لکیر اس کی پلک سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھ موندلی تھی۔ جیسے روشنی سے بے زاری محسوس کی ہو۔ روشنی کو بھی غصہ آگیا۔ وہ اس سے دور ہٹ گئی۔

"ممانے بھیجے ہیں۔" جواب مختصر تھا۔ اس نے اصرار نہیں کیا۔ روشنی اور بھی دور ہٹی۔

"تو پھر تم نہیں مانو گے؟" وہ فائل بک کو بھیگی آنکھ سے دیکھتی رہی۔

"نہیں۔" اس نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

"اس میں تمہارا بھلا ہے اور میرا بھی ہے۔" وہ ابھی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

"مجھے ایسے بھلے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سابقہ کڑوے لہجے میں کہا۔

"چند سال بعد بھی یہی کہنا۔" اب وہ طنز کررہی تھی، اپنا غصہ نکال رہی تھی یا پھر اسے جذباتی وار سے ڈھانا چاہتی تھی۔

"آزما لینا۔۔۔" وہ اس کی ویران آنکھوں میں جھانکنا جھکا تو کھلی ہوئی فائل بک پہ اس کی نگاہ پڑ گئی۔ ایک شکستہ سا پیلا پھٹک کاغذ اس کی نگاہ کے حصار میں آگیا۔

اس پہ کچھ لکھا تھا؟ کیا لکھا تھا؟ اس نے آنکھیں مسل کر پڑھا۔

ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ پھر کئی دفعہ۔۔۔ کاغذ زمین

پر گر گیا۔ اس نے اٹھایا پھر پڑھا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" وہ چیخ پڑا، چلا اٹھا، بھڑک گیا۔ روشنی کی لکیر اس کی آنکھ میں اتر آئی تھی۔ جیسے ہر منظر واضح ہوگیا۔ روشنی اس کے وجود پر پھیلتی رہی۔ وہ چیختا رہا۔ چلاتا رہا۔ سوال پہ سوال کرتا رہا، مگر جواب کہاں تھا؟ کس کے پاس تھا؟ جواب شاید کہیں نہیں تھا۔

وہ تو خود پیلے، زرد، خستہ حال کاغذ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

اس نے اپنی نادانی میں یہ کیسا اژدھا سامنے لا رکھا تھا؟

☆ ☆ ☆

وہیل چیئر کے پہیوں کو چین نہیں تھا۔ نظریں کلاک پہ جمی تھیں۔ ایک، دو، تین۔۔۔ جانے کتنے منٹ گزر گئے۔ پھر فون کی گھنٹی بجی اور اس کا انتظار ختم ہوگیا۔ اس نے بے تابی سے لپک کے فون اٹھایا دوسری طرف وہی تھیں۔ اسے سمجھاتی بجھاتی، لتاڑتیں۔۔۔

"غلط فیصلہ کیا تو بہت پچھتاؤ گی میری جان! جب سے واپس آئی ہوں۔ دل کو پتنگے لگے ہیں۔ جیسے کچھ غلط ہوتا جارہا ہے۔" وہ اپنا خوف بیان کررہی تھیں۔

"میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بہت مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ اس کے الفاظ نے ہزاروں میل دور بیٹھی اس بوڑھی ہوتی عورت کو لحہ بھر میں شانت کردیا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا۔۔۔ بہت بڑی نادانی کرنے جارہی تھیں۔ شکر ہے تمہیں عقل آگئی۔" اب وہ اس کی بے وقوفی کو دوہرا رہی تھیں اور وہ لب بھینچے سنتی رہی۔

"میرا فیصلہ غلط نہیں، انتخاب غلط تھا۔۔۔ میں نے فیصلہ نہیں، انتخاب بدل لیا ہے۔" اس کی آواز مدھم تھی۔ کچھ سوچتی ہوئی، کچھ عجیب، کچھ پراسرار ہزاروں میل دور بیٹھی وہ عورت پھر سے بھونچکی رہ گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میرا انتخاب درست نہیں تھا۔ میں اپنے حلق پہ خود چھری مارنے لگی تھی۔ شکر ہے بروقت عقل آگئی۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔ آخر بند تو مجھے باندھنا ہی ہے۔ البتہ انتخاب بدل گیا ہے۔ جانتی ہیں نا۔ سامنے والی سلطانہ کو۔ وہی موٹی بھدی، پکی عمر کی رحم دل عورت جس کا دل مخلوق خدا کے درد سے بھرا ہوا ہے۔ شریف اور سیدھی ایسی کہ رات بھر ایک پاؤں پہ کھڑا کروں تو کھڑی رہے۔ میرا فیصلہ اسی کے حق میں ہوا ہے۔" اس کے پراسرار لہجے میں کمال کا سکون تھا۔

دوسری طرف وہ لمحوں میں شانت ہوگئیں۔ اس کے فیصلے نے ان کے اندر روح پھونک دی۔

"تو پھر گھر میں باندھی اس قیامت کو واپس بھجوا دو۔" انہوں نے ذرا سر جھٹک کر نخوت سے کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کان سے پکڑ کے باہر نکالوں گی۔" وہ بڑے اطمینان سے کسی کی ہستی ہلا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کے سر پہ کھڑی چیخ رہی تھی۔ وہ اسے گالیاں دیتی، کوسنے دیتی، غصہ کرتی، طنز کرتی، اس پہ کیچڑ اچھالتی۔ وہ اسے ذلت کے تھپکارے مارتی، نفرت انڈیلتی، زہر اگلتی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ عجیب لڑکی تھی جو اس کے سامنے سر نہ اٹھاتی۔ پلٹ کے جواب نہ دیتی۔ بس سر جھکا لیتی۔

"ڈورے ڈالنے آئی ہو یہاں؟ میرے گھر پہ قبضہ کرنے آئی ہو؟ تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔ چار چوٹ کی مار دوں گی۔ چونڈے میں خاک ڈال دوں گی۔ تم مجھے جانتی نہیں۔"

"تم یہاں سے جاتی کیوں نہیں؟ میں نے نوکرانی

رکھ لی۔ اب تمہاری ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔ میں تمہارے کرتوت بتاؤں گی۔ تمہارے معاشقوں کی داستان دکھاؤں گی۔" وہ غلاظت اگل رہی تھی۔ وہ اپنا کام جاری رکھتی یہ ایک چپ کی بکل اوڑھے دن رات اپنا کام کیے جاتی۔

"تمہاری ڈائری دکھاؤں گی۔ جیسے ادھر سب نے دھتکارا۔ یہ بھی تمہیں منہ نہیں لگائے گا۔ بے کار آس لگا کر بیٹھی ہو۔" اس کا غیض اترتا ہی نہیں تھا۔ دن رات اسے کچھ کے لگائے جاتی۔

پہلے خود اسے بلایا۔ آٹھ مہینے تک نرمی اور محبت کا چولا پہنے رکھا۔ پھر جانے اچانک اسے کیا ہو گیا۔ سامنے والے فلیٹ میں آنے والی اس مسکین عورت کی آمد کے ساتھ ہی یہ بدل گئی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ سلطانہ اس کے کام کی بندی جو نکلی تھی اور یہ ہمیشہ کی خود غرض۔۔۔ سلطانہ کو دیکھ کر اس کے ایثار، خلوص اور خدمت کو بھول گئی۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ یہ ذلت برداشت کر رہی تھی مگر اس کے لبوں پہ کبھی گلہ نہیں آتا تھا' مگر جب اس کے کردار پہ حملہ آور ہوئی تب وہ درد اور اذیت سے بلبلا اٹھی تھی۔

"میرے کردار پر گندگی مت اچھالو۔ میرے صبر کو مت آزماؤ۔۔۔ دیکھو اسے کچھ بھی بتا دوں تو تمہاری حیثیت میرے برابر ہو جائے گی۔" اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی۔ شاید دس سالوں میں پہلی مرتبہ اور اس کی بات اسے آگ لگا گئی تھی۔ وہ اسے کیا "جتا" رہی تھی؟

"بڑا اتراتی ہو "کاغذ کے اس ٹکڑے پر جو پرزہ پرزہ ہو گیا۔ کوئی ثبوت نہیں اور بنا ثبوت کے تم دو کوڑی کی ہو۔" وہ ہنسنے لگی تھی۔ وہ اسے یہاں سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اسی میں اس کی بقا تھی اور وہ خود کو اپنے ہر عمل میں حق بجانب سمجھتی تھی۔

"اتنا تکبر کیوں ہے اس کرسی پہ بیٹھ کر بھی۔۔۔ تمہیں اللہ یاد نہیں آتا۔" وہ کمزور لڑکی بے بسی سے رو پڑی تھی۔ تب اس کا بھیجہ الٹ گیا تھا۔ وہ اس کے بال کھینچتی فرش پہ گرا گئی۔ پھر اسے گھسیٹ گھسیٹ کر باہر دروازے تک لے آئی۔

"مردود عورت! نکل میرے گھر سے۔ اب واپس مت آنا۔ میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" وہ کسی جن زادی کی طرح دہاڑ رہی تھی۔ غصے اور غیض نے اسے طاقت سے بھر دیا تھا۔ وہ اسے مکے مار رہی تھی۔ گالیاں دے رہی تھی۔

"تمہارے معاشقے کے پمفلٹ چھپوا کر گلی گلی' بازار بازار لگوا دوں گی۔ عزت عزیز ہے تو واپس نہ آنا۔" وہ نخوت سے بولتی مڑ گئی تھی۔

پھر دروازہ بند ہو گیا۔ جیسے اس پر زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہی۔ وہ کہاں جائے گی؟ کدھر جائے گی؟ اس اجنبی دیس میں اس کا اپنا کون تھا؟ جانے وہ کب تک اپنے نصیب پہ روتی رہتی۔ پھر اچانک اس کے قریب کوئی اجنبی شخص آیا وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تعجب میں گھرا پھر اچانک پہچان گیا۔

"میں واجد ہوں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ۔"

اس آدمی کے تعارف نے روتی ہوئی اس لڑکی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی اور روتی رہی۔ پھر ان کے پوچھنے پہ وہ برسوں کے لاوے کو اپنے اندر سے نوچ کھسوٹ کر نکالنے لگی۔ اس کی زندگی کے دردناک قصے کو سن کر وہ ادھیڑ عمر آدمی فکرمند ہو گیا تھا۔

"تمہارا فرض تھا۔ تم اسے سچائی بتاتیں۔ سچ اس تک پہنچانا چاہیے تھا۔ پھر حالات مختلف ہوتے۔ تم ٹھوکروں پہ نہ ہوتیں۔" اس کے آنسوؤں اور ذلت میں بھیگی کہانی سن کر بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں دکھ اور تاسف بھر گیا تھا۔ وہ اسے نرمی سے ڈپٹتا رہا۔

"میرے پاس ایک ثبوت تھا جسے اس کی ماں نے پھاڑ دیا۔" وہ اپنی بے بسی کی وجہ بتا رہی تھی۔ وہ اب بھی اپنی قسمت پہ رو رہی تھی۔ تب واجد صاحب نے اس کے اندر قیامت کی روح پھونک دی۔

"تم غم زدہ نہ ہو۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کا دیا ایک ثبوت ہے۔ میں وہ ثبوت اس تک پہنچادوں گا۔ تمہاری زندگی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے بٹی! پھر کوئی بھی تمہیں دھکے دے کر گھر سے نہ نکالے گا۔"

انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ پھر اسے دوبارہ گھر کے دروازے تک چھوڑ گئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ذلت بھری زندگی میں قدم رکھنے چلی گئی۔ یہ اس کا من چاہا نصیب تھا۔ وہ اس گھر سے زندگی بھر نکلنا جو نہیں چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بے قرار ہو کر پورے گھر میں وہیل چیئر گھماتی چکر لگا رہی تھی ان دنوں اس کے دل کو پنکھ لگے ہوئے تھے۔ چین کسی پل نہیں تھا۔

اس دن بھی وہ اندر کی بھڑاس نکالتی گھوم رہی تھی جب پوسٹ مین ایک رجسٹری دے گیا۔ شاید پاکستان سے آئی تھی۔ ممانے کوئی "سرپرائز" بھیجا تھا۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈ پڑ گئی۔ تو گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ جیسے سرشار ہو گئی۔ وہ رجسٹری اس کے سامنے کھولنا چاہتی تھی وہ لاؤنج میں آگئی۔ اس کے سامنے وہی چنڈال بیٹھی تھی۔ روتی ہوئی خود کو مظلوم ثابت کرتی۔ اس کے اندر باہر آگ لگ گئی۔ وہیں رک کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"میرا وجود قابل نفرت ہے۔ تمام عمر سب کی نظر میں حقارت ہی میرا مقدر رہی میرا خلوص، محبت، ایثار بھی میرے لیے بوند برابر کسی کی محبت نہ لا سکا۔ مجھ سا کون بد قسمت ہو گا۔" اندر سے سہمی سہمی آواز آرہی تھی۔ بھیگی آواز، بھیگا لہجہ وہ اس کے شوہر کے سامنے بیٹھی سر جھکائے رو رہی تھی۔ اسے آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے رجسٹری کو ہاتھ میں دبوچ لیا۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ میں ہوں نا۔۔۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" وہ محبت سے بول رہا تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھی عورت کے تن من سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"آپ سچ میں مجھ سے پیار کرتے ہیں؟" وہ بے یقین تھی، حیران تھی، اس انکشاف نے اسے دنگ کر دیا تھا۔ باہر بیٹھی عورت کا شوہر بھی اس اعتراف پہ خود بھی حیران رہ گیا تھا۔

"ہاں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ اٹل تھا۔ وہ لڑکی عقیدت اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو گئی۔ اس کی روح محض اسی "اعتراف" پر شانت ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہی کافی تھا۔

"اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تو مجھے واپس بھجوا دیں۔ میں آپ کی زندگی میں مشکلات بھرنا نہیں چاہتی۔"

وہ نم آواز میں کہہ رہی تھی۔ اپنا درد، دکھ، غم اور صدمات سے بھرے دل کی ہر حکایت چھپا کر درخواست کر رہی تھی۔ وہیل چیئر پہ بیٹھی عورت جیسے گنگ رہ گئی۔ اسے اس مکار، کٹنی، فراڈ، فسادن سے ایسی امید نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" اسے سوال کرنے کی عادت تھی۔ چاہے یونیورسٹی کا کوریڈور ہوتا، چاہے سر زمان کی کلاس ہوتی، چاہے نفسیات کا لیکچر ہوتا۔ چاہے وہ سفر میں ہوتی، گھر میں ہوتی، کچن میں ہوتی جب اسے عدل سے یہ اہم ترین "سوال" پوچھنے کا خیال آتا تب اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کی سہیلیاں حیران نہیں ہوتیں۔ وہ اس کے پاگل پن سے واقف تھیں، مگر ایم اے نفسیات کے سر زمان ہرگز واقف نہیں تھے۔ وہ اس کی چوری اکثر پکڑ لیتے اس کا سیل فون جھپٹ لیتے اس کے ٹیکسٹ پڑھ لیتے، اسے گھورتے، غصہ ہوتے، کبھی کلاس سے نکال دیتے، کبھی کلاس میں کھڑا کر دیتے، کبھی اپنے دفتر بلا کر چودہ طبق روشن کرتے پھر بھی ماہ من کو اس ایک "سوال" کو ٹائپ کرنے، سینڈ کرنے سے روک نہیں پاتے تھے۔ اکثر ماہ من کو شاپنگ کرتے، کپڑے خریدتے، جوتے لیتے،

کاسمیٹکس چھانتے، کتابیں ڈھونڈتے، بڑے بڑے تھیلے اٹھائے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے بھی اس سوال کی ہڑک بیدار ہو جاتی تھی۔ تب وہ تھیلے زمین پر رکھتے کچھ بغل میں دبائے، کچھ کو دانتوں میں دبائے میسج لکھنے میں مصروف ہو جاتی، اکثر چلتے چلتے ٹیکسٹ لکھتی تب اس کی کسی نہ کسی سے ٹکر ضرور ہو جاتی تھی۔ گواہ جو تھیں۔

اور اس وقت ماہ من قلم کو منہ میں دبائے "تھیوریز آف اموشنز" پہ غور کرتی عدل کو دیکھتے ہوئے اچانک ہڑبڑا کر بولی تھی یوں کہ کتابوں میں سر دیے عدل کو بھی ہڑبڑانے پر مجبور کر چکی تھی۔ اس نے چونک کر ماہ من کو دیکھا تھا پہلی سرسری سی غصیلی نظر، پھر جانے کیوں گہری ہوتی چلی گئی۔ شاید ماہ من کے چہرے پر پھیلے تاثرات ہی کچھ ہلچل مچا دینے والے تھے اور ہلچل تو اس کے اندر صدیوں کی مچی تھی۔ یہ تو عدل کبیر ہی تھا جس نے خود پر مضبوطی کا ملمع چڑھا رکھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پگھلتا مگر ظاہر نہ کرتا۔

"تم تو میرے اس سوال پہ منطقہ البروج (راس منڈل) میں کھو جاتے ہو، آسمانی بارہ برج گننے لگتے ہو، اللہ کی مخلوق! میرا سوال ایسا "چکرا" دینے والا تو نہیں ہوتا؟" ماہ من کی ناراض آواز اسے سوچوں کے تلاطم سے باہر نکال لائی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا تھا۔ پھر ماہ من کو دیکھنے لگا۔ پلک جھپکے بغیر، بنا نگاہ موڑے، بنا رخ بدلے، دیکھتا رہا۔ پڑھتا رہا، حفظ کرتا رہا۔ اس کی گندمی رنگت کا سنہرا پن، اس کی سنہری آنکھوں کا گلابی پن، اس کے تراشیدہ ریشمی مٹھی بھر بال۔ کندھوں سے کچھ اوپر۔۔۔ لہراتے، جگمگاتے، کہانیاں سناتے۔۔۔ ایک کے بعد ایک۔۔۔ چہرے پہ بکھرتے جاتے۔۔۔

وہ خوب صورت تھی، مگر کوئی ماہ پیکر، پری پیکر نہیں تھی۔ عدل کے سامنے تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ جانے پھر کیوں دل اسی کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔

شاید اس لیے کہ وہ عدل کے اکلوتے ماموں کی

کئی دفعہ کچن میں کھانا پکاتے، کھانا جلاتے، دودھ ابالتے، ہاتھ جھلساتے، کپڑے جھلساتے وہ "اوئی اوئی" کرتی عدل سے ہم کلام ہوتی۔ کئی دفعہ واش روم میں برش کرتے، دانت صاف کرتے، چہرے پہ کریم ملتے وہ بھاگتے بھاگتے سیل تک آجاتی۔ تب اس کی لاڈلی پھوپھو اس کے پاگل پن، جنون، محبت اور بچپنے پر مسکرائے جاتی تھیں آخر ماہ من کے عدل سے عشق کی

چھوٹی اور بہت لاڈلی بیٹی تھی، وہ یا من سے دو سال چھوٹی تھی اور عدل کی ہم عمر۔ ان دونوں نے ایک ساتھ دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ انہیں ایک ہی پالنے میں ڈالا گیا تھا۔ وہ ایک مدت تک ایک ہی پالنے میں رہے۔

ماہ من پیدائشی بد قسمت تھی۔ اس کی ممی اسے پیدا کر کے ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ عدل کے ماموں، مامی میں بہت سے جھگڑوں، لڑائیوں اور فسادات کے بعد طلاق ہو گئی تھی۔ اس کی ممی دونوں بچیوں کو اکلوتی نند کے گھر پھینک کر یورپ چلی گئیں۔ پھر ان کے پاپا نے بھی جانے میں دیر نہ کی۔ ایک صبح بہن کے نام مختصر سا نامہ لکھا اور ملک بدر ہو گئے۔ پھر سالوں بیت گئے مگر ان کی کوئی خبر نہ آئی۔

یوں یا من اور ماہ من عمر بھر کے لیے عدل کی مما غفیرہ کی ذمہ داری بن گئیں۔

اور وقت گواہ تھا کہ عدل کی مما کو اپنی بھتیجی ماہ من سے اور پاپا کو اپنی بھتیجی سے کیسا لازوال عشق رہا تھا۔

وہ جیسے پھر سے ہڑبڑا گیا کیونکہ ماہ من کے تیور بہت بگڑ رہے تھے۔

"کبھی تو میرے سوال کا مدلل، جامع، رومانوی، افسانوی ٹائپ جواب دے دیا کرو۔" وہ غیض کے عالم میں اپنا نازک ہاتھ لہراتی اسے دھمکا رہی تھی۔ پھر جیسے اس کے کندھے پہ یکے بعد دیگرے کئی مکے پڑے۔ عدل کے ہونٹوں پر تکلیف کے بجائے مسکراہٹ آگئی۔

"یہ سی ایس ایس کا امتحان ہے میری جان! مجھے محبت پر کوئی رومانوی ناول نہیں لکھنا۔۔۔ تم نے نفسیات

میں ٹانگ اڑا کر بھی پہلی نہ سہی دوسری پوزیشن لے جاتی ہے۔ پر مجھے تو اپنی پوزیشن بچانے کے لیے جان مارنا پڑے گی۔" وہ مسکراتا ہوا حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ حقیقت جس میں یامن کے لیے ستائش تھی۔ محبت تھی' تفخر تھا۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر تھا اس کی تعریف کرتا تھا اور اسے اپنے سے آگے سمجھتا تھا۔

یامن اس کے خاندان کا سرمایہ تھی۔ بہت لائق فائق' ذہین فطین' حاضر جواب' شوخ' ہنگامہ پرور' زندہ دل۔ چلبلی۔ مما اسے گھر کی رونق اور بابا اپنے باغ کی بلبل کہتے تھے۔

وہ صرف پالنے میں ہی عدل کے ساتھ نہیں تھی۔ بلکہ عمر بھر سے اس کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسکول میں پہلا قدم رکھا تھا۔ پھر یہ ہاتھ کبھی چھوٹا ہی نہیں۔ اسکول' کالج اور پھر یونیورسٹی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ جیسے یک جان' دو قالب۔ ایک دوسرے کے ہمراز' دوست' ایک دوسرے کا سایہ۔ ان کی چاہت اور دوستی کے قصے یونیورسٹی کے چپے چپے پہ تحریر تھے۔ ان کے دوست' ساتھی' ہمراہی ان کے دل کی دھڑکنوں کے گواہ تھے۔

آئی۔ آر میں ماسٹرز کے بعد عدل اور یامن دونوں سی ایس ایس کی تیاری میں جت گئے تھے' مگر اسی دوران اپنی چند سہیلیوں کے اصرار پہ یامن نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرلی۔ ان دنوں زیر عتاب نفسیات کا مضمون تھا۔

یامن کی شادی طے پاگئی تھی۔ بابا نے اس کے لیے ڈاکٹر عمیر کو چنا تھا۔ بہت قابل' ذہین اور نیک طینت جوان تھا۔ ان کی فیملی کا حصہ بنا تو جیسے خوشیاں دوبالا ہوگئی تھیں۔

یامن شادی کے بعد اپنے باپ کے گھر میں شفٹ ہوگئی۔ وہ ان کے پڑوس میں ہی تھا۔ کچھ سال پہلے بیچ کی دیوار گرا کر دونوں گھروں کو تقریباً" ایک ہی کرلیا تھا۔ لان ملا لیے گئے تھے یوں بظاہر یہ ایک ہی ولا لگتا ہرا بھرا' خوب صورت' محبتوں سے گندھا۔

عدل کبیر' ڈاکٹر ہلال کبیر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے دیکھتے تو اندر محبتوں کے سوتے پھوٹ پڑتے۔ وہ چلتا تو چراغ روشن ہو جاتے جگنو جھلملا اٹھتے' ستارے چمکنے لگتے۔

تھوڑا نخریلا' تھوڑا ضدی ضرور تھا پر یہ غرور اس پہ سجتا تھا' بڑا حلیم بھی تھا۔ نرم مزاج بھی تھا۔ باکردار' باوقار' بااعتماد۔ وہ اپنے باپ کے لیے "فخر" کا باعث تھا۔ بے شمار خوبیوں اور خوب صورتیوں کا مجسمہ۔

تب ہی تو بہت سال پہلے۔ کئی دھند لکوں کی اوک میں انہوں نے اپنے لخت جگر کو کسی کے لیے منتخب کرلیا تھا۔

ان کے بیٹے کی روشن آنکھوں سے "مدھ" بہتا تھا۔ وہی مدھ جس کی یامن الیاس اسیر تھی اور یہی مدھ کسی اور کو بھی گرفتار وفا کرچکا تھا۔

عدل کبیر اپنے دادا کی نسل کا واحد امین اور وارث تھا۔ اسی سے ان کی نسل چلنی تھی۔ عدل کبیر سے آگے اور مشعلیں روشن ہونا تھیں۔ دیے جلنے تھے اور ڈاکٹر ہلال کبیر اس وقت کے انتظار میں لمحہ لمحہ گزار رہے تھے۔ ان کا بیٹا بہت محکم قوت ارادی کا مالک تھا۔ فیصلوں میں اٹل' مضبوط اور مستحکم۔ انہیں امید تھی کہ عدل کبیر ان کی آنکھوں میں قرنوں سے بستا خواب تعبیر کی صورت میں ضرور سامنے لائے گا۔

اور وہ "خواب" بھلا کیا تھا؟

اس سے صرف غفیو واقف تھیں۔

مگر جو خواب ڈاکٹر ہلال کبیر کی زندگی تھا۔ ان کی فتح تھا' وہی خواب غفیو کبیر کی شکست تھا۔ ان کی موت تھا۔ اس خاموش جنگ سے ابھی کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

"تم کس بھنور میں پھنس گئے؟" یامن نے غصے میں آکر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ تب وہ گہرا سانس لے کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ یامن کو مزید چڑا دیا کرتی تھی۔

"تمہارا سوال مشکل نہیں' مگر بہت وقت چاہتا ہے۔ اتنا وقت جو تم سے تم تک کی تشریح کے لیے کافی ہو۔" وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی سجائے مسکرانے لگا تھا۔ پھر اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی تھی کیوں کہ یامن من پسند جواب پاکر "گل فام" بن جارہی تھی۔ گلابی' سرخ' آگ سی۔ اس کے گال تپنے لگے تھے۔ شہری آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔ اول تو وہ یامن کے اس سوال کا جواب کم دیتا تھا اور اگر کبھی موڈ میں آجاتا تب اس کے لفظوں کی سحر انگیزی سے وہ کچھ بول نہ پاتی' نظر اٹھانہ پاتی۔

"اب بولو نا' چپ کیوں ہوگئیں؟ کچھ اور بھی کہوں کیا؟" عدل اسے چھیڑ رہا تھا۔

"رہنے دو' اتنی مشکل سے تو "کچھ" اگلوایا ہے۔ میری ناتواں جان کے لیے بس اتنا ہی کافی ہوگا۔"

"کروڑ کی صرف ایک بات ہوتی ہے جانم! مجھے لفظ لفظ کھیلنا نہیں آتا۔"

"اور یہ ایک بات قرنوں بعد ترس ترس کر سننے کو ملتی ہے۔" شکوہ بالآخر اس کے لبوں پر مچل ہی گیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے عدل کی محبت کا یقین نہیں تھا' یہ بھی نہیں تھا کہ وہ محبت کے اس سفر میں تنہا تھی۔ بس اس سے عدل کی بے رخی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ چاہے وہ بیگانہ پن اس کی "مصروفیت" کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوتا۔

یامن میں بہت سی کمزوریاں تھیں۔ وہ لمحوں میں بدگمان ہوجاتی تھی۔ تھوڑی شکی بھی تھی' شاید عدل کی محبت نے اسے بے انتہا حساس بنا دیا تھا' مگر جو بھی تھا' یامن' عدل کے دل کا ایک حصہ تھی اور یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم تھی۔

یامن بہت بے صبری تھی۔ وہ ماسٹرز سے پہلے ہی منگنی چاہتی تھی' مگر عدل اس حق میں نہیں تھا۔ یامن کی "ضد" نے اسے غفیو سے بات کرنے پر مجبور کردیا تھا تب مما کے ہی سمجھانے پر یامن خاموش ہوگئی تھی۔

وہ اس وقت دودھ کے دو گلاس ٹرے میں رکھے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ ماربل کی ٹرے میں دو بلوریں گلاس تھے۔ جن میں کٹے ہوئے بادام اور پستے مکس تھے۔ یہ دودھ یامن کو بہت پسند تھا جبکہ عدل کو اتنا پسند نہیں تھا۔ غفیو جب بھی یامن کے لیے دودھ بناتی تھیں تو عدل کے لیے بھی بنا لیتیں۔ وہ جانتی تھیں' یامن کی خاطر وہ کچھ بھی کرسکتا ہے اور جب وہ ناک بھوں چڑھا کر گلاس خالی کردیتا تب انہیں یامن پہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ اسے کریلے گوشت کھلا دیتی۔ اسے چکن بریانی کھلا دیتی' اسے بیف برگر کھانے پہ مجبور کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ عدل سبزی خور ہے۔ پھر بھی زبردستی اپنی بات منوالیتی اور جب وہ یامن کی بات مان لیتا تب اس کی گردن غرور سے تن جاتی تھی۔ انہیں اپنے شوہر سے یامن اور عدل کے لیے ایک "جنگ" لڑنا تھی۔ انہیں یقین تھا کہ فتح ان ہی کے نصیب میں ہوگی۔ وہ اسی لیے مطمئن تھیں' انہیں اپنی فطری جبلی "ضد" پر بھی فخر تھا۔ وہ عزیز از جان شوہر سے کچھ بھی منوا لینے کا فن رکھتی تھیں۔

اس وقت بچوں کی "افسانوی" بحث پہ غور کرتی وہ دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتارتی اندر داخل ہوئی تھیں تب وہ دونوں بیک وقت چونکے تھے' پھر دونوں ہی ہنسنے لگے۔

"پاگل ہوچکے تم دونوں۔" انہوں نے ماربل کی ٹرے سینٹرل ٹیبل پہ رکھ کر مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔

"اور یہ تم ہر روز میرے بیٹے کا امتحان لینے کیوں بیٹھ جاتی ہو؟" انہوں نے یامن کے مشہور زمانہ سوال "تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ یامن لمحوں میں گلابی پڑ گئی۔

"اللہ مما جی! یہ زیادتی ہے۔ آپ نے پھر سن لیا۔" اس نے کشن اٹھا کر منہ پر رکھ لیا تھا۔

"میں نے تو سننا ہی تھا۔ آخر دن میں اٹھارہ ہزار مرتبہ جو دہراتی ہو تم۔" وہ عدل کی طرف متوجہ ہوئی

تھیں جو خواہ مخواہ کتاب پہ نظر جمانے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم ایک ہی دفعہ میری بیٹی کو مطمئن کیوں نہیں کردیتے۔"

"میری ایک زندگی اسے مطمئن کرنے کے لیے ناکافی ہے مما! اسے یقین آبھی جائے تب بھی یہ اپنی خصلت سے مجبور ہے۔" عدل نے کشن کے پیچھے "دیکھی دیکھی" کرتی امن پہ چوٹ کی تھی۔ اس نے فوراً" کشن رخ روشن سے ہٹالیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر غفیرہ نے عدل کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا۔ کیوں کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر امن عموماً" واک آؤٹ کرجاتی تھی۔ پھر دو دو دن تک غصہ نہیں اترتا تھا۔ ہزار منتوں' ترلوں' خوشامدوں کے بعد بھی وہ نہ مانتی۔ اکثر عدل کے بابا اسے مناتے تھے۔ سچ تو یہ تھا' امن کو بگاڑنے میں کچھ کچھ ہاتھ ہلال کبیر کا بھی تھا۔ انہوں نے امن کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اچانک عدل نے کچھ یاد آنے پر گفتگو کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ تذکرہ ایسا تھا کہ امن اور غفیرہ دونوں کا منہ بن گیا۔

"بابا کی کال آئی تھی۔ اپنی ڈاک کا پوچھ رہے تھے۔ انہیں ایک دو ہفتے مزید لگیں گے۔ کوئی خط آئے تو سنبھال لیجئے گا۔" وہ ماں کو تاکید کررہا تھا۔ غفیرہ کچھ بے چین ہوگئی تھیں۔

وہ اپنے باپ کی ہر چیز اور ہر رشتے کے لیے بہت حساس تھا۔ وہ اپنے باپ کے منہ سے نکلے لفظوں کی بھی حفاظت کرتا تھا۔ آج صبح ان کی کال آئی تھی۔ وہ اپنی ڈاک کا پوچھ رہے تھے۔ آج کل کے تیز رفتار دور میں انہیں صرف ایک بندی کی طرف سے خطوط ملتے تھے۔ پھر وہ ان کا جواب بڑی محبت اور فرصت میں لکھتے تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے بڑے موڈ اور ترنگ میں عدل کو بتایا تھا۔

"دو لوگوں کے لیے میں کچھ بھی قربان کرسکتا ہوں۔" وہ جانے کس رو میں تھے سو کہہ گئے۔

"ایک میں اور ایک؟" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی تھی۔ ایک دم بابا کے چہرے پہ روشنی سی پھیلنے لگی تھی۔ ایسی روشنی' ایسا نور جو عدل نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تھم سا گیا۔

"عدل اور جزا۔" انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ایک جذب کے عالم میں ان کے لبوں سے موتی بکھرے۔ عدل گویا دنگ سا رہ گیا۔ اس نے باپ کے چہرے پر ایسی روشنی' ایسا محبت کا نور کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسی ضوفشانی' ایسی چمک' ایسی دمک' ایسی تابناکی؟

"عدل اور جزا؟" عدل نے زیر لب دہرایا تھا۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر میٹھی آواز میں بولے تھے۔

"ڈاکٹر ہلال کبیر کا عدل اور اس کی جزا۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کردی تھی۔ اس بات میں کتنے بھید تھے؟ کتنے اسرار تھے؟ وہ سمجھ ہی نہ پایا۔ جان ہی نہ پایا' مگر چہرے پہ بکھرتی چاندنی دیکھ کر خوشی ضرور ہورہی تھی۔

"اس زمانے میں کون خط لکھتا ہے؟ اب تو انٹرنیٹ اور موبائل فون کا دور ہے' مگر بابا کو تو 1950ء کی دہائی کے خطوط آتے ہیں۔ حد ہے۔ آج کے دور میں بھی کوئی اتنا فارغ ہے؟" امن کی آواز میں واضح ناگواری تھی۔ دراصل بابا کے خطوط کا ذکر کسی کو بھی پسند نہیں تھا' نہ مما کو نہ امن کو اور نہ امن کو۔ کیوں کہ ان خطوط سے جس کی نسبت تھی' وہ اس گھرانے کی سب سے بڑی چڑ بنتی جارہی تھی۔

بابا اسے جوئی کہا کرتے تھے۔ ایک پسماندہ گاؤں کی گنوار۔۔۔ مگر اس کے باپ کی بڑی محبوب ہستی تھی۔ مما کو اپنی اور بابا کو اپنی بھتیجی سے بڑا لازوال عشق تھا۔ اور وہ ڈاکٹر ہلال کبیر کی اکلوتی بھتیجی ہی تو تھی۔

"ارے۔۔۔ اس کا نام کیا تھا بھلا؟ آں۔۔۔ ہاں' یاد آیا۔۔۔ جوئی۔۔۔ کیسا ماسیوں جیسا نام ہے جوئی' موئی کر موئی۔" امن نخوت سے سر جھٹک کر بولی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ اندر کا غصہ نکال رہی تھی۔ یہ نام غفیرہ کبیر اور امن الیاس کی "چڑ" تھا اور یہ "چڑ" غصے اور جھنجلاہٹ میں تب بدلتی جب عدل اس موضوع پہ گفتگو کرتا تھا۔

"بری بات امن! یوں نہیں بولتے۔" یہ بہت نرم سی سرزنش تھی' مگر پھر بھی امن کو بہت بری لگی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ عدل کبیر اپنے باپ کے لفظوں' ان کی چیزوں اور ان سے منسوب رشتوں کے لیے کتنا حساس ہے۔ پھر بھی۔۔۔

"اور یہ بھی خوب کہی۔ محترمہ! پاکستان کے کتنے ہی دیہات آج بھی موبائل فون اور انٹرنیٹ کے وجود بلکہ علت سے پاک ہیں۔ کیا پتا' وہاں بھی فون نہ ہو۔۔۔" اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا تھا' مگر غفیرہ بھی ذرا ٹھٹھک گئی تھیں۔

"اس نے فون تو کیا تھا' پچھلے دنوں۔۔۔ کیا پتا' انفرادیت جتانے کے لیے خط لکھتی ہو۔" امن جز بز ہوکر بولی تھی۔ تب غفیرہ نے بمشکل ناگواری دبائی۔

"اسے کیا پتا ہوگا' انفرادیت کس چڑیا کا نام ہے اور تم لوگ کس بے کار بحث میں پڑ گئے ہو۔ اپنا وقت ضائع مت کرو۔ آرام سے پڑھو اور دودھ پی لینا۔ یاد سے عدل!" انہوں نے جاتے جاتے عدل کو تنبیہہ کی تھی تب امن نے جیسے انہیں تسلی دی۔

"آپ فکر مت کریں مما! عدل کا گلاس بھی خالی ہوگا۔" اس کا تیقن عدل کو "چونکا" گیا تھا۔ اس کا لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جی مما! یہ میرا بھی گلاس خالی کردے گی۔" عدل نے امن کو جیسے چڑایا تھا' مگر وہ چڑے بغیر اس کے ہاتھ میں گلاس تھما چکی تھی۔ عدل نے آرام سے گلاس پکڑا اور خالی کردیا۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ امن کی کسی بات سے انکار بھلا وہ کرسکتا تھا؟

غفیرہ مسکراتے ہوئے پلٹ گئی تھیں۔ اب ان کا رخ اسٹڈی روم کی طرف تھا۔ یہ اسٹڈی روم ہلال کبیر کا تھا ان کا قیمتی خزانہ بھی یہیں موجود تھا۔ مور کھ سے آئے گئے خطوط' ان کا اثاثہ۔۔۔ غفیرہ کے اندر لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ وہ عورت تو مرچکی تھی' مگر اپنے پیچھے اپنی جانشین کو چھوڑ گئی۔ رشتے میں غفیرہ کے شوہر کی بھاوج لگتی تھی' مگر غفیرہ کی پہلی چڑ وہی تھی اور دوسری چڑ اس کی بیٹی۔

وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اسٹڈی ٹیبل تک آئی تھیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق وہاں ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ مہر سے پتا چلا ایک ہفتہ پہلے کا تھا۔ انہوں نے گہرا تکلیف دہ سانس خارج کرکے لفافہ چاک کیا۔ یہ خط مور کھ کے ہائی اسکول میں زیر تعلیم دسویں جماعت کی طالبہ نے لکھا تھا۔ انہوں نے تحریر پہ نظریں جمادیں۔

☼ ☼ ☼

بہت خوب صورت شام تھی۔ دور پہاڑوں پہ سفید گھاس کھل رہی تھی' انتہائی سفید' ملائم' مگر ٹھنڈی۔ یہ گھاس نہیں تھی۔ سفید برف تھی' روئی جیسی' ملائم' نرم' مگر سرد۔۔۔ ہاتھ لگانے سے سن کرتی ہوئی' جمادیتی ہوئی' کپکپادیتی ہوئی اور اس سے آگے طویل رقبے پر پھیلا آلو بخارے کا باغ۔۔۔ یہ موسم پھل کا نہیں تھا' تب ہی درختوں کی شاخیں خالی تھیں۔ پتے جھڑ مرے تھے۔ ہریالی ختم تھی۔ سوکھی ٹہنیاں' بے پتوں کی شاخیں۔ ٹنڈ منڈ' ویران' بے آسرا' بے حجاب۔ جیسے اس کی لڑکھڑاتی زندگی کی عملی تصویر۔

دور کہیں عشاق گایا جارہا تھا۔ کوئی منچلا اپنے شبستان میں آتش دان میں لکڑیاں جلا کر تنہا بیٹھا راگ چھیڑ رہا تھا۔ دکھ بھرا راگ' درد سے لبریز' غم سے بھرپور' کوئی دنیا سے ہارا ہوا' عشق کا مارا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر کسی کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔ دور پل کے پار بل کھاتی سڑک پہ اکا دکا ٹریفک رواں تھی۔ بتیاں سی جلتی بجھتی تھیں' مگر کوئی سواری اس طرف نہ آئی۔ چمکیلی کاروں میں وہ ایک سفید کار کہیں نہیں

تھی۔ اس کی آس ٹوٹ گئی جیسے پورے وجود میں تھکاوٹ اتر آئی۔

وہ اوس میں بھیگی چھال پہ چلتے چلتے لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس کی راہ میں بے شمار کنکر تھے، بے انتہا پتھر تھے۔ آس پاس اندھیرا پھیلنے لگتا، روشنی گم ہوتی اور خوف اس پہ پنجے جما دیتا۔ اس خوف میں وہ کسے تلاش کرتی تھی؟

صبح بنارس جیسے اس ایک شخص کو جسے دیکھ کر اس کی زندگی پہ لگ کر بن بننے لگتی۔

وہ روشن صبح جیسا شخص اجالے لے کر آتا تھا۔

وہ کیکر کی چھال پہ کھڑی ہو کر آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کے زخم لیے روشن صبح جیسے شخص کا انتظار کرتی تھی۔

گاڑیاں آتی، جاتیں، پرندے اڑتے، پھدکتے، آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتے، پھر آشیانوں کی طرف بھاگ پڑتے۔ شام رات میں ڈھلتی، رات خوف کی طرف بڑھتی اور اس کا انتظار برف کی طرح جمنے لگتا۔

وہ انگلیوں پہ گنتی۔۔۔ ایک، دو چار، آٹھ، دس اور جانے کتنے ہی دن؟ آنے والے نے آنا تو تھا پھر آیا کیوں نہیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی، لوگ اس پر ترس کھاتے، ہمدردی جتاتے، افسوس کرتے۔

"ارے، وہ آیا نہیں۔۔۔ اب تو تائی بھی نہ رہی۔ ضد ٹلی، تائی چلی۔۔۔ اب تو کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ وہ آتا اور لے جاتا۔" گھر کی چار دیواری میں پرسہ دینے والی عورتوں کی کھسر پھسر اسے خوف زدہ کرتی، پریشان کرتی، پہروں رلاتی۔ اوپر سے مامی کی پھنکار۔

"ارے۔۔۔ بھول بھال گیا ہوگا۔۔۔ کون یاد رکھتا ہے۔ بوسیدہ عہد ناموں کو۔ جب پھیرے لگاتا تھا تب بڑھیا نہ مانی۔ اور اب۔۔۔ یہ سِل ہمارے سینے دھر گئی۔ اب نہ آیا وہ۔" مامی کا چہرہ غیض سے بھر جاتا بڑا بھیانک ہو جاتا اور آنے والے ڈراؤنے وقت کا خوف اسے راتوں کو سونے نہ دیتا۔

آج بھی امید ٹوٹی، خواب ٹوٹے۔ بل کھاتی سڑک سے کوئی بھی کار اس طرف آتی دکھائی نہ دی تھی۔ وہ بھیگی چھال پہ چلتی رہی، آسمان سے برف گرتی رہی۔ بستی ابھی دور تھی، بیچ میں بہت موڑ تھے۔ وہ ندی کنارے چلنے لگی۔ برف گر رہی تھی۔ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا جیسے سفید ملمع میں چھپا ہوا تھا۔ دور پہاڑوں سے اترتی دھند رستوں کو دھندلانے لگی، منزلوں کو چھپانے لگی۔

یہ کوئی پسماندہ گاؤں نہیں تھا۔ یہاں موبائل فون کی سہولت تھی، بجلی تھی، پڑھنے کے لیے اسکول تھا۔ ڈسپنسری بھی تھی بڑے کاروباری لوگوں کا گاؤں تھا۔ یہاں پھولوں کی کاشت ہوتی۔ موسم کا ہر پھل اگایا جاتا۔ صحت مند مویشی تھے، ڈیری فارم تھے۔ دودھ، دہی، لسی کا کاروبار چلتا۔ نامی گرامی کمپنیوں کی گاڑیاں دودھ خریدنے آتی تھیں۔

خود اس کے ماموں کا کھوئے اور موتی چور کے لڈو کا کاروبار تھا۔ وہ صرف موتی چور کے لڈو بناتے اور بڑے وسیع پیمانے پہ کھویا تیار کرتے تھے۔ بہت دور دور سے لوگ یہاں کھویا لینے آتے۔

موتی چور کے لڈو یہاں کی مشہور سوغات تھی۔ ماموں پہلے خود یہ کام کرتے تھے پھر ماموں کے جانے بعد تائی اور مامی کرنے لگیں۔ بعد میں ساری ذمہ داریاں اس کے نازک کندھوں پہ آ پڑی تھیں۔

اس وقت بھی صبح اور رات کے بے شمار کاموں کا بوجھ ابھی سے اس کے کندھوں کو تھکانے لگا تھا۔ گھر جاتے ہوئے اس کے قدم من من کے ہونے لگے اتنے کام تھے کہ کاموں کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس نے اپنے کمزور ہاتھوں کو دیکھا۔ لمبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ۔ مشقت کی چکی میں دن رات پسنے والے ہاتھ۔ جنہیں کوئی بہت پیار سے چوما کرتا، پھر آنکھوں سے لگاتا، پھر محبت سے کہتا۔

"جوئی! تم میری آنکھوں کا نور ہو۔" ان کے لہجے میں شدت ہوتی، محبت ہوتی۔ وہ اتنے پیارے بول

بولتے۔ اتنے میٹھے لفظ کہتے۔ جوئی نے ایسے لفظ نہ کبھی سنے نہ کبھی برتے۔ کیا بول اتنے شیریں جیسے بھی ہوتے ہیں؟ وہ حیران ہوتی، گم صم رہتی۔ ان کی باتیں اسے خوابوں کی نگری میں لے جاتی تھیں۔ جہاں پھول تھے، خوشبوئیں تھیں، جگنو تھے، تتلیاں تھیں۔ جہاں کوئی غم نہ تھا، مشقت نہ تھی۔ پھٹکار اور جھڑکیاں نہ تھیں۔ مار نہیں تھی، دھتکار نہیں تھی۔ وہ کتنی حسین نگری تھی؟

"جتنے میٹھے بول آپ بولتے ہیں۔ اتنے میٹھے لفظ اس کو بھی آتے ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھتی۔ بے قراری سے انہیں دیکھتی۔ جیسے ان کا ہر جواب اس کے لیے نئی زندگی کا پیغام لانے والا تھا۔ وہ اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے، دیکھتے، پڑھتے اور دھک سے رہ جاتے۔ وہاں رنگوں کی کچھ انوکھی کہانیاں رقم ہوتی نظر آتیں۔ اک نئی داستان، وہ ان کے دکھائے، بتلائے رستے پہ اندھا دھند بھاگنے لگی تھی۔۔۔ بے دھڑک، بے خوف۔۔۔ جیسے منزل پہ کھڑا شخص اس ہانپتی کانپتی کم سن لڑکی کو تھامنے کے لیے ازل سے کھڑا تھا۔ اس کا یقین انہیں ڈگمگا دیتا۔ بے چین کر دیتا، مضطرب کر دیتا، کیا جس راہ کی مسافر وہ اسے بنا رہے تھے، وہ راہ اسی کے لیے تھی؟

"ہاں۔۔۔ وہ مجھ سے زیادہ میٹھا اور اچھا بولے گا تم سے۔" وہ اس کی خوشی کو بڑھا دیتے۔ وہ لمحوں میں گلاب ہو جاتی، جیسے سارے جھڑے پتے جھڑ جاتے نئی کونپلیں سی کھل اٹھتیں۔

"اور مجھ سے زیادہ محبت کرے گا تم سے۔" وہ اسے چھیڑتے، تنگ کرتے، مسکرانے پہ مجبور کرتے اور وہ سارے خوف بھلا کر ہنسنے لگتی۔

"کوئی آپ سے بڑھ کر بھی جوئی کو چاہ سکتا ہے؟" اس کا سوال بڑا پر یقین ہوتا۔

"میری دعا ہے۔۔۔ تمہیں مجھ سے بڑھ کر محبت کرنے والا ملے۔" ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ ماضی کے کسی لمحے میں کھو جاتے اور وہ انہیں کسی "یاد" میں نمناک دیکھ کر لڑکھڑا جاتی۔ جیسے اب ان کی

"یاد" میں لڑکھڑا رہی تھی۔ اسے ان کی باتیں، محبتیں اور عہد یاد آتے۔ وہ اسے بھولنے والے نہیں تھے، ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ چلتے چلتے بستی میں اتر آئی۔ منزل اگرچہ ابھی بھی دور تھی، مگر یہاں اندھیرا نہیں تھا۔ یہ ساہوکاروں کا بازار تھا۔ رات کے وقت یہاں محفل سجا کرتی تھی۔ بستی کے سارے ساہوکار اکٹھے ہوتے تھے۔ یہاں پورے مہینے کے "مال" کا حساب کتاب ہوتا تھا۔ اس بازار کو "ساہوکارا" کہا جاتا تھا۔ آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ یقیناً" گل شام بھی یہاں موجود تھا اور گل شام خان کی موجودگی اس کا "ہراس" بڑھا دیتی تھی۔

آج گل شام عرف گوشی کی ترنگ کا عالم الگ ہی تھا۔ مہینے کی پہلی تاریخ "مال" کا حساب کتاب، خرچا، لاگت وصولی، منافع ایک کے بعد ایک ترتیب۔ جب منافع بڑھتا تو گوشی کی حرص اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ "مال" اور منافع پہ صرف اپنا ہی حق سمجھتا تھا۔ حالانکہ اس "مال" کو بنانے، تیار کرنے میں جوئی کھی کی طرح پگھلتی تھی۔ پھرکی کی طرح گھومتی تھی، رات رات بھر جاگتی، رات رات بھر کرچھے چلاتی، ہاتھ ہلاتی، اس کے کندھے ٹوٹنے لگتے تھے۔ ہاتھ دکھنے لگتے تھے، کمر اکڑ جاتی تھی۔ کھڑے کھڑے پیروں میں ورم آجاتا۔ مگر اس کے حصے میں پھوٹی کوڑی تو کیا ایک لفظ ستائش کا نہ آتا۔

جب نانی زندہ تھیں، تب حالات اتنے برے نہیں تھے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر لڑ جھگڑ کر فساد کھڑا کر کے جوئی کا حصہ نکلوا لیتیں۔ لاکھوں کے منافع میں جوئی کے لیے صرف چار پانچ سو نکلتے تھے۔ وہ بھی مامی دل پر پتھر رکھ کر نانی کے منہ پہ مارتی اور موقع دیکھ کر جوئی کے حلق سے نکلوا بھی لیتی۔

مامی بہت کمینی عورت تھی اور گوشی ماں کی طرح ہی بہت کمینہ تھا۔ اسے کولہو کے بیل کی طرح جوتے رکھتا۔ ڈھور ڈنگروں سے بڑھ کے کام لیتا۔ جوئی نے گڑیا کھیلنے کی عمر میں مشقت کرنا شروع کی تھی۔ اس کے کھیلنے کی عمر میں کونڈا پکڑا دیا گیا تھا اور کتابیں پڑھنے کی عمر میں اس نے "عشق" پڑھنا شروع کر دیا تھا اور وہ اپنا کام بڑی دلچسپی سے کر رہی تھی۔

بوسیدہ چپل کے تلوے نیچے نوکیلا کنکر آیا۔ وہ بے ساختہ کراہ کر پتھریلی زمین پہ پیر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی، معاً کنکروں پہ بھاری بوٹوں کے چلنے کی آواز آئی۔ کوئی ٹھوکروں سے کنکر اڑا رہا تھا۔ جوئی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ماموں کا گھر اب چند قدم کے فاصلے پر تھا مگر جوئی سے اٹھنا محال تھا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں، سر جھکا لیا۔ معاً" بھاری اور کٹیلی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جوئی کا جھکا سر جھکا ہی رہا۔ وہ سامنے کھڑے بندے کی شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ یہ تم ہو؟ آوارہ گردی کرنے نکلی ہوئی تھیں۔ گھر میں کاموں کا انبار ہے تم کو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں۔" وہ دانتوں میں پان دبائے غضب ناک ہوا تھا۔ یقیناً" جیبیں نوٹوں سے بھر کر اس کی تلاش میں نکلا تھا۔

ایک وہی تو تھا جسے لحہ بھر بھی جوئی دکھائی نہ دیتی تو ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ ضرورتاً" ہی سہی، کم از کم گل شام کو اس کی یاد تو آتی تھی۔ ورنہ اس وقت اس کی دونوں بہنیں اور ماں گرم لحاف میں گھسی پستے، چلغوزے کھا رہی تھیں۔ ایسے وقت میں تو نہیں جوئی کبھی بھی یاد نہ آتی۔

"میں پل تک گئی تھی۔" ایڑی کے درد کو بھلائے اس نے خوف زدہ انداز میں مجرمانہ صفائی پیش کی تھی۔ تب گل شام کا سفید چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ شکاری کتے کی طرح نتھنے پھول گئے۔ اس کے ماتھے پر لاتعداد بل ابھر آئے تھے۔

"ہاں۔۔۔ بے آس لوٹی، نامراد ہوئی۔۔۔ وہ دیا لو، کرپالو، مہربان، ہمدرد، غم خوار تمہارا غم جان نہیں آیا۔" گوشی کو طنز کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ سر جھکائے سسکیاں بھرنے لگی۔

"اس دفعہ تو لمبی ڈنڈی مار گیا۔ لگتا ہے وادی کے مرنے کا پتا چل گیا۔ اب نہیں لوٹے گا۔" گوشی ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو دیکھتا مسکرایا تھا۔ یہ وہ رجسٹر تھا جس پر روزمرہ کے آمد و خرچ کا حساب درج تھا۔ آج حساب کتاب کا دن تھا۔

"ایسا نہیں۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔ وہ کسی کے سامنے بھی بول نہیں سکتی تھی۔ اس میں اعتماد کا فقدان تھا۔ وہ ایک دبو اور کمزور لڑکی تھی۔ خوف زدہ ہو جاتی، گھبرا جاتی، ہکلا جاتی۔ تب ہی تو ہر کوئی اس پہ حکومت کرتا تھا۔ مامی، اس کی چار بیٹیاں، ایک بیٹا۔ وہ سب کے لیے کمزور ترین رعایا تھی۔

"لکھوا لو مجھ سے، کوئی نہیں لوٹے گا۔ ایویں "سیالے" میں لور لور پھرتی ہو۔ یہ جاڑے کا موسم ہے۔ تاپ چڑھا کر بستر پہ پڑی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ میرا "کام" ٹھپ کرنے کا ارادہ ہے۔" گوشی نے غیض سے سر جھٹک کر بھوری بھیانک موٹی آنکھوں سے گھورا تھا۔ جوئی کی جیسے روح فنا ہو گئی تھی۔ اسے خوف آیا۔ گوشی اسے جھانپڑ نہ دے مارے۔ ویسے تو وہ عادی ہی تھی۔ مامی، گوشی اور اس کی بہنوں سے جھانپڑ کھانے کی۔ جس کا جب دل چاہتا، اس پہ ہاتھ اٹھا لیتا۔

"میں جاتی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا، مگر کراہ کر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی زمین اور نوکیلے پتھر۔ اوپر سے گوشی جیسے جن کا خوف۔ وہ تھر تھر کانپتی رہی۔

"اٹھ بھی جا اب۔۔۔" گوشی نے زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔ گوشی کی گرفت سخت تھی۔ جوئی نے بازو چھڑانا چاہا۔ وہ اسے ساتھ لیے آگے بڑھنے لگا۔

"کھڈے ہیں یہاں۔ گر کے مرنا ہے کیا؟" گوشی نے پھر سے پھنکار کر کہا تھا۔ جانے اسے غصہ کس بات پہ تھا؟ جوئی الجھ گئی۔ آج تو پہلی تاریخ تھی۔ پیسہ ملتا تو وہ پھٹنے کے قریب ہو جاتا۔ جیبیں بھرتا اور شہر نکل جاتا۔ دو چار روز عیاشی کے بعد گھر آتا۔ موڈ خوش گوار ہوتا۔ تب جوئی پہ سختی میں کچھ کمی آجاتی تھی۔ وہ تو دعا کرتی تھی۔ گوشی کی جیب کبھی خالی نہ ہو اور وہ گھر لوٹے ہی نہ۔۔۔ مگر بعض دعائیں۔۔۔

"مر گئی تو کر چھے کون ہلائے گا۔ کونڈے میں دال کون کوٹے گا۔ میرا کام تو گیا۔ کشی اور دمی تو بیکار مال ہیں۔ ایک نمبر کی ہڈ حرام اور ماں ان کی استاد۔"

اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ پھر جانے کیا گنگنانے لگا۔ جوئی نے گھر کا پھاٹک دیکھ کر کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ مگر چھت پہ رسوئی کا خیال، لوہے کا ہیبت ناک طویل و عریض کڑاہا۔ جس میں چار چار دن کڑچھا چلانے کے بعد کھویا تیار ہوتا تھا۔ سو کلو دودھ کو ایک ساتھ خشک کرنا۔ پھر گگری میں بھیگی چنے کی دال کو سل پہ پیسنا۔۔۔ اس کے روم روم میں تھکاوٹ بھر گئی۔ گرم بستر کا خیال ہوا ہونے لگا تھا وہ سمجھ گئی تھی، گوشی اسے ڈھونڈتا کیوں پھر رہا تھا۔ اسے پھر سے ایک بڑا آرڈر ملا تھا۔

محنت، مشقت، سختی اور تلخی بھری رات پھر سے منتظر تھی۔ نانی جب زندہ تھیں تب بھی وہ اسی طرح محنت کرتی تھی۔ صرف لڑائی اور فساد کے خوف سے۔ نانی کی اس کے لیے حمایت مامی کو آگ بگولا کر دیتی تھی۔ گھر میں دنگل مچ جاتا۔ گالی گلوچ، گندی اور فحش باتیں۔۔۔ مامی بڑی بدزبان اور جھگڑالو تھی۔ نانی بھی مامی کی ٹکر۔۔۔ ایک سیر تھی تو دوسری سوا سیر۔ وہ ان کے جھگڑے پر خوف زدہ ہو جاتی۔ رسوئی میں جا کر چھپ جاتی، کڑاہے میں کڑچھا ہلا ہلا کر خوف کم کرتی۔

وہ فطرتاً" بزدل تھی۔ نانی عمر بھر اس کی بزدلی کو ختم نہ کر سکیں وہ اسے بے خوف اور بہادر دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اسی قدر ڈرپوک اور بزدل تھی۔ شور، لڑائی، ہنگامہ اسے خوف زدہ کر دیتا تھا۔ وہ آنکھیں میچے اپنے اور نانی کے مخصوص ڈربے میں گھس جاتی تھی۔ اسٹور روم سا یہ ڈربا صرف دو لوگوں کے لیے کافی تھا۔ جب نانی کی ٹانگیں بیکار ہوئیں تب مامی نے نانی کو اٹھوا کر "ڈربے" میں ڈال دیا تھا۔ نانی کے کس بل نکل گئے تھے۔ اب ان کا زور نہیں چلتا تھا۔

"گگری میں دال پھول چکی۔۔۔ اسے نکال کر سل پہ پیس لو۔ بہت بڑا آرڈر ہے۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہاری مدد کو بخت گل بھی آجائے گی۔ کشی اور دمی سے کوئی توقع نہیں۔"

وہ سرخ ہونٹوں کو پونچھتا، حکم چلاتا اپنے کمرے کی طرف چلایا گیا تھا جبکہ جوئی کے حواس جیسے جاتے

رہے۔ تو آرڈر موتی چور کا تھا۔ انتہائی وقت طلب' مشکل ترین کام تھا۔ جسم کی چولیں تک ہل جاتیں۔ کندھے اتر جاتے' دال پیستے پیستے کمر تختہ ہو جاتی تھی' مگر ایک لفظ تھکاوٹ اور انکار کبھی اس کے لبوں پہ نہیں آتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی تھی' کمزوری تھی یا فرماں برداری؟

وہ بھاری قدموں سے لکڑی کا زینہ چڑھنے لگی۔ کام کے لیے رسوئی اوپر تھی۔ یہاں پر کھویا اور لڈو بنتے تھے۔ نانی اور ماموں کے وقتوں سے یہ کاروبار چل رہا تھا۔ پہلے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ ماموں کے انتقال کر جانے کے بعد نانی نے کاریگر' ہنرمند ہٹا دیے تھے۔ کاروبار میں تنخواہ داروں کی گنجائش نہیں تھی۔ ماموں کے بعد حالات کشیدہ ہو گئے تھے۔ تنگی کا دور تھا' وسائل کم پڑنے لگے۔ تب نانی نے ہمت جوان کی' اور خود میدان میں اتر آئیں۔ کچھ جانور فروخت کر دیے اور کچھ دودھ' دہی' مکھن کے لیے بندھے رہنے دیے۔

جوئی کو سب یاد تھا' ذرا ذرا سا وقت۔۔۔ نانی کی مشقتیں۔۔۔ محنت' سختیاں۔۔۔ وہ فولاد جیسی عورت تھیں۔ باڑے میں جانوروں کا گوبر اٹھاتیں' چارہ کاٹتیں' ان کی سیوا کرتیں' دودھ دوہتیں۔ بڑے بڑے مٹکے اٹھا کر لکڑی کا زینہ چڑھتیں اور کڑاہے میں کھویا تیار کرتیں۔ لڈو بناتیں۔۔۔ رات بھر جاگتیں۔

مامی کو بچوں سے فرصت نہ تھی' پانچ بچے' سب نخریلے' ضدی' جھگڑالو۔۔۔ بالکل ماں کی طرح۔۔۔ ایک ہنگامہ مچائے رکھتے۔ ہر وقت لڑتے' جھگڑتے' ایک دوسرے کے بال نوچتے' لڑکیاں بڑی تھیں۔ گوشی چھوٹا تھا۔ پھر بھی بڑی بہنوں کی شامت لائے رکھتا۔

تب جوئی سہم جاتی' ڈر جاتی' خوف زدہ ہو کر نانی کے پہلو سے چپک جاتی۔ اسے مامی کے سب بچوں سے خوف آتا تھا۔ وہ سب عجیب مزاج کے تھے۔ ایک دوسرے پہ آیا غصہ جوئی پہ اتارتے' نانی جب بھی نظر سے اوجھل ہوتیں۔ جوئی کی شامت آجاتی۔ جوئی ان سب کی مار کھا کے پلی بڑھی تھی۔ نانی کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی۔ وہ روتی کانپتی سائے کی طرح نانی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ایسے ہی نانی کے پہلو سے چپکے رہنے کی وجہ سے اسے موتی چور کے لڈو بنانے کا فن آگیا تھا۔ نانی دو دو بوریاں چنے کی دال صاف کرتیں' نگری میں بھگوتیں۔ پھر دال پھول جانے پر سل پہ پیستیں۔ پھر ململ کے کپڑے میں اسے چھانتیں۔ پوری رات لڈو کی تیاری میں گزرتی تھی۔ بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا تھا۔

کئی کئی دن دال صاف کرنے میں گزر جاتے۔ دھیرے دھیرے جوئی نے نانی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اسے نانی پہ ترس آیا۔ وہ تنہا پورے کنبے کی کفالت کے لیے محنت کرتی تھیں۔ باقی سب تو کھانے والے تھے۔

نانی کا بوجھ بٹانے کی غرض سے پہلے پہل اس نے دال میں سے کنکر چننا شروع کیے تھے۔ پھر وہ نگری میں دال بھگو دیتی۔ سل پہ پیسنے کا کام دشوار تھا۔ یہ کام نانی کو کرنا پڑتا۔ وہ بس نانی کے کندھے دباتی اور انہیں مہارت سے ہاتھ چلاتے دیکھا کرتی تھی۔ پھر اسے پسی ہوئی دال میں مقدار کا پورا پورا حساب رکھ کر گھی ملانا بھی آگیا۔

وہ مٹی کے بڑے بڑے کونڈے میں جمے خالص دہی کو اٹھا لاتی۔ دودھ کا ڈرم کھول دیتی۔ نانی' دودھ' دہی پسے آمیزے میں ڈالتیں اور جھاگ بننے تک مکس کیے جاتیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ خمیر جیسا پھول جاتا۔ جوئی غور سے دیکھتی' پھر کڑاہا بھر کے گھی کڑکڑایا جاتا تھا۔ موٹے چھید والی لوہے کی بہت بڑی چھلنی کڑاہے پہ رکھی جاتی اور آمیزہ بھر بھر کے چھلنی میں ڈالا جاتا۔ پھر اسی تیزی سے آمیزہ ہلا ہلا کر بوندیاں گرائی جاتی تھیں۔ یہ کام بہت تیزی سے کیا جاتا۔

نانی اکیلی تھک جاتیں' ٹوٹ جاتیں' اکثر غصہ میں آجاتیں۔ تب جوئی پھر ان کی مدد کو تیار ہو جاتی۔ وہ بوندیوں کو پہلے سے تیار کیے شیرے میں ڈالتی' پھر ٹھنڈا ہونے پر نکال کر ململ کی چادر پہ پھیلا آتی۔ اگلی صبح الائچی دانے کوٹے جاتے' بوندیوں پہ چھڑکے جاتے

اور لڈو تیار کر کے چاندی کے ورق لگائے جاتے۔ انتہائی مزیدار' خوش بودار' خستہ' دیسی گھی سے تیار شدہ موتی چور کے یہ لڈو علاقے بھر میں مشہور تھے۔ لوگ دور دراز سے آرڈر لے کر آتے۔ ماموں کے مرنے کے بعد آرڈر کم ہو گئے تھے' مگر دھیرے دھیرے سہی' ایک دفعہ پھر سلسلہ روزگار چل پڑا تھا۔

نانی سے اکثر کام خراب ہو جاتا تھا۔ کچھ بڑھاپا تھا' کچھ نظر کمزور تھی۔ وہ کڑکڑاتے گھی سے بہت تیزی کے ساتھ بوندیاں نہیں نکال سکتی تھیں۔ کئی دفعہ آرڈر خراب ہوتا۔ گاہک ناراض' کام مندا پڑنے لگا۔ تب نانی حواس باختہ ہو جاتی تھیں۔ پھر پہلی مرتبہ بہت کم سنی میں نانی کو نہ پا کر تنہا اکیلے جوئی نے دو کلو لڈو تیار کر لیے۔

اس نے پہلا لڈو سات سال کی عمر میں بنایا تھا۔ انتہائی خستہ' لذیذ' خوش بودار۔ نانی نے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ کیا یہ جوئی نے ہی بنایا تھا؟ ان کو اگلے بہت سے دن بھی یقین نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ عملی طور پر نانی کا ہاتھ بٹانے میدان میں اتر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایسی لذت' ایسی مٹھاس تھی کہ دنوں میں گاہکوں کا تانتا لگ گیا۔

ان کے لڈو بڑے بڑے حلوائیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ لذت اور مہارت کے کمال نے کاروبار کو بہت وسعت دی تھی۔ یہاں تک کہ کام بڑھ گیا۔ گوشی کو بھی کام میں لگنا پڑا تھا۔ پہلے پہل وہ منہ بناتا رہا۔ پھر پیسے کا چسکہ پڑ گیا۔ نانی بیمار ہوئیں تو گوشی کے ہاتھ میں کاروبار کی ڈور چلی گئی۔ اسے پیسے کی لت لگ گئی تھی۔ آرڈر پہ آرڈر لے آتا۔

مالی حالات بدلنے لگے۔ اسی لیے جلد ہی عسمی اور نمی نمٹ گئیں۔ مامی کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے۔ گھر کی مرمت بھی کروالی' بس نانی کا علاج نہ ہو سکا۔ اس کے لیے نہ کسی کے پاس فرصت تھی نہ رقم۔ وہ پورا دن اسٹور نما ڈربے میں پڑی رہتیں۔ چیختیں' چلاتیں' گالیاں کوسنے دیتیں۔ بس جوئی بھاگ بھاگ کے نانی کو دیکھنے آتی۔ عجیب وسوسے اور خدشے اسے لاحق تھے۔ وہ شیرے میں لتھڑے ہاتھ لیے بھاگ بھاگ کے زینہ اترتی' نانی کے پاس جاتی' انہیں اوکھتا پا کر واپس پلٹنے لگتی تب نانی کراہتی آواز میں اسے سمجھاتیں۔

"کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو؟ ارے ان حرامیوں کو مفت کی نوکر مل گئی۔ اس ذلیل گوشی سے کہو' کاریگر رکھے۔ تم کسی کے باپ کی ملازمہ نہیں۔ خبردار' رسوئی میں مت جانا۔ یہ لوگ تجھے نگل جائیں گے میری بچی! کس دن میں نے تجھے لڈو بنانا سکھا دیے۔ ہائے' یہ کیا ظلم ڈھایا۔" وہ خود کو کوسنے لگتی تھیں۔ گالیاں دیتیں اور بال نوچتیں۔ وہ کتنی مخبوط الحواس ہو گئی تھیں۔

"تجھے آگ' دھواں کالا غبار بنا دے گا۔ خاک دھول ہو جائے گی۔ بس کتابیں پکڑ کر اسکول جایا کر۔۔۔ میری بچی! خود کو ضائع نہ کر۔" وہ روتی رہتیں۔ سر پٹختیں' مگر جوئی کو رسوئی جانے سے روک نہیں پاتی تھیں کیونکہ مامی اور گوشی کی پھٹکار اسے خوف زدہ کر دیتی تھی۔ وہ جھگڑے اور لڑائی سے بچنے کے لیے کام میں جُت جاتی۔ اس گھر کے لوگ اسے کام کرتا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

بس ہوا کچھ یوں کہ تھوڑے دن بعد گوشی ایک لڑکی بخت گل کو لے آیا۔ یہ لڑکی اس کی مدد کے لیے لائی گئی تھی۔ دراصل وہ لڑکی کام سیکھنے کے لیے آئی تھی۔ بہت باتونی' تھوڑی چالاک اور کافی پھرتیلی تھی۔

اس وقت بھی لکڑی کے ایک ایک قدمچے پہ پیر رکھتی وہ سب کی سن رہی تھی۔ وہ سب جو گرم لحاف میں دبکے پڑے تھے۔ دانتوں میں خستہ' نمکین چنے کو کرچ کرچ نگل رہے تھے۔ جوئی کے قدموں کی آواز نے جیسے سب کو چوکنا کر دیا تھا۔ دراصل یہ اس کے قدموں کی آواز نہیں تھی۔ بلکہ زینے کی بھاری زنجیر کی آواز تھی۔ یہ خاص زنجیر تھی جو الارم کا کام دیتی تھی۔ کوئی بھی زینہ اترتا' چڑھتا گھر کے کونے کونے میں آواز جاتی تھی۔ ماموں نے چور اچکوں سے ہشیار رہنے کے لیے لگوائی تھی' مگر جوئی کو اس کی آواز بڑی ناگوار گزرتی

تھی۔

وہ کام ادھورا چھوڑ کر نیند سے نڈھال کبھی بھی نیچے نہیں آسکتی تھی کیوں کہ قدمچے پہ پہلا پیر رکھتے ہی زنجیر بجتی، کھنکتی چیں چیں کرتی شور مچادیتی تھی۔ تب مای اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر گردن نکالے "فورا" پھنکارنے لگتی۔ گول کمرہ زینے کے قریب تھا۔ مای نے "فورا" چیں چیں، کھڑکھڑ کی آواز سن کر کھڑکی کھول لی تھی۔

"آگئی واپس؟ نہیں آیا تمہارا ہوتا سوتا... آنے والا بھی نہیں۔ جانے کس گمان میں ہو۔ ارے اس کے تو سر کی بلا ٹلی۔ تار بھیجے مہینہ بھر سے اوپر ہوگیا۔ بڑھیا کا پُرسہ دینے بھی نہیں آیا۔ کیوں آئے گا بھلا بڑھیا نے کب اسے گھاس ڈالی۔ اپنی اکڑ اور غرور میں ہی رہی۔"

مای کو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

"ایک نمبر کا فریبی، دھوکے باز تھا۔ بس تجھے باتوں سے ہی بہلاتا رہا۔" گوشی نے بھی زہر اگلنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"یہ اس کی مکارانہ باتوں پہ ریجھ گئی۔ وہ رغبت رکھتا تو ضرور لوٹتا۔ میں تو کہتی ہوں بڑھا دو اس کے دو بول۔" دمی نے بھی ناریل کاٹتے مذاق اڑایا تھا۔ جوئی کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ نیچے سے مای کی پھر سے آواز آئی۔

"مگرے میں رلی لگادے۔ بجلی کا بھروسا نہیں۔ سویرے تک مکھن جمانا بھی ہے۔" حکم نامہ تیار تھا اور سرتابی کی مجال بھلا کس کی تھی۔

اس نے قدم رسوئی کی طرف بڑھا دیے۔ یہ ہال کمرے جتنا بڑا کچن تھا۔ پوری چھت پہ مشتمل۔ یہاں بڑے بڑے بھاری سیاہ کڑاہے رکھے تھے۔ بالس جتنے کڑچھے، تانبے، پیتل کی پراتیں۔ ایک قطار میں بھاری مٹکے رکھے تھے۔ جمے ہوئے دودھ سے بھرے۔ جن میں بھاری "رلی" کو باری باری لگاتا تھا۔ ایک طرف دو تین بلونیاں، مدھانیاں، مٹکنیاں رکھی تھیں۔ سب دودھ بلونے کے آلے تھے۔

رسوئی کے ایک طرف مال کی تیاری کا سامان رکھا تھا۔ مہینے بھر کا سامان۔ دیسی گھی کے بھاری کنستر جن میں ڈالڈا کی ملاوٹ گوشی کے مجبور کرنے اور ہٹ دھرمی دکھانے پر کی جاتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی بے ایمانی کاروبار کے لیے بہت ضروری تھی۔

دوسری طرف "شکر تری" کی بوریاں رکھی تھیں۔ سرخ کھانڈ سے بھری۔ یہ کھانڈ بوندیاں بنانے کے کام آتی۔ چنے کی دال کا چھت سے لگتا ڈرم بھی موجود تھا۔ پچھلے سال دال میں کیڑا لگ گیا تھا۔ ساری دال آٹا ہوگئی۔ ناقص، خراب بو زدہ۔ پر گوشی نے کسی کی نہ سنی۔ اسی دال سے لڈو بنوائے۔ یہ تو جوئی کے ہاتھ کا کمال تھا۔ مہارت اور لذت کا کمال تھا۔ جو لڈو خراب نہ بنے۔ خوشبو، ذائقہ، لذت برقرار رہی۔ پھر بھی جوئی کا دل اوبتا رہا۔

ناقص مال تیار کرکے لوگوں کو دھوکا دینا، حرام رزق کمانا... کیا یہ جائز تھا؟ وہ سوچتی، الجھتی، مگر زبان بند رکھتی، بولنے کی صورت میں گوشی کے جھانپڑ کون کھاتا؟

"ملانی نہ بنا کر، بڑی آئی گناہ ثواب بتانے والی۔" وہ بدزبانی پہ اتر آتا تھا۔ گالی گلوچ کرتا یا ہاتھ اٹھاتا۔ جوئی ڈر جاتی تھی۔ اب تو نانی کی ڈھال بھی نہیں تھی۔ وہ گوشی کے منہ ہی نہ لگتی۔ اس کے سائے سے بھاگتی، مگر وہ اس کا سایہ بنا ہی رہتا۔

کبھی کبھی قربان، نچھاور، واری، نثار، فدا بھی ہونے لگتا۔ تب جوئی کی جان پہ بن آتی۔ وہ بھاگ کر گول کمرے میں گھس جاتی۔ بے سبب مای کے پیر دبانے لگتی۔ گوشی کی ذو معنی گفتگو سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ گول کمرہ، مای کا کمرہ اس کی جائے پناہ۔

جوئی سر جھٹک کر دال کو لوہے کے ٹب میں سے نکالنے لگی تھی۔ پھولی ہوئی دال کو ساری رات بھگویا تھا۔ جوئی کے ہاتھ سرد پڑنے لگے، ٹھٹھرنے لگے، کانپنے لگے۔ باہر دھند نما برف پڑ رہی تھی۔ قیامت خیز سردی تھی۔ اس نے سب سے پہلے آتش دان میں لکڑیاں سلگائی تھیں۔ کچھ دیر بعد آگ جل اٹھی۔

شعلے ابھرنے لگے، رنگ نکلنے لگے۔ ماحول کو گرم کرنے لگے۔

وہ سرد، کمزور ہاتھوں سے دال پیسنے لگی تھی۔ اس کے کانوں میں کچھ گزری باتیں اترنے لگیں۔

"تم تو میری جان ہو... میں خود کو بھول سکتا ہوں، مگر تمہیں نہیں۔" کسی نے بڑی محبت سے اسے یقین دلایا تھا۔ کسی نے بڑی محبت سے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔

اس نے گیلا ہاتھ پیشانی پہ رکھا، چھوا، کچھ محسوس کیا۔ وہاں اب بھی گرم بوسے کا احساس باقی تھا۔ جوئی کی آنکھیں بھیگنے لگیں، اس نے اپنا کام چھوڑ کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھے۔ پھر اٹھ کر رسوئی کے آخری کونے میں رکھے چھوٹے سے صندوق تک آئی۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ ٹوٹی ماربل کی اینٹیں، پرانے برتن، ناکارہ اوزار۔ اس نے ماربل کی اینٹ اٹھا کر نیچے سے زنگ آلود اکلوتی چابی نکالی تھی۔ اب وہ بڑی بے تابی سے صندوقچہ کھول رہی تھی۔ بوسیدہ کترنوں، پرانے سویٹر، چادر اور کتابوں کے ڈھیر کے دوسری طرف لفافے میں کچھ موجود تھا۔ اس نے وہ لفافہ نکال کر آنکھوں کے سامنے کیا۔

یہ لفافہ نانی نے مرنے سے پہلے دیا تھا۔ زرد بوسیدہ سا ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا، مگر جوئی کی جیسے پوری زندگی کی حکایت اس پہ تحریر تھی۔ وہ بے یقینی سے دیوانہ وار لفافے میں موجود کاغذ کو چھوتی رہی، چومتی رہی محسوس کرتی رہی۔ اسی لفافے میں ایک تصویر بھی تھی، چار سال پہلے یہ تصویر وہ خود جوئی کو دے کر گئے تھے۔ وہ تصویر میں موجود ان دو چمکتے روشن چہروں کو دیوانہ وار دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں پہ ہلکی سی بڑبڑاہٹ تھی۔

"ڈاکٹر چاچو! آپ اور آپ کا بیٹا میری پوری زندگی کا کل اثاثہ اور کل سرمایہ ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" روشن اسکرین پہ الفاظ چمک رہے تھے۔ یہ الفاظ دن میں کئی مرتبہ چمکتے۔ اس نے گہرا سانس کھینچا اور گلاس ونڈو سے سلکی پردے ہٹادیے۔ باہر صبح کا نور بکھرا تھا۔

وہ اندر تک جیسے مہک گیا تھا۔ سیل فون کی ٹون پھر سے بج اٹھی تھی۔ وہ چونک کر سیل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسکرین پھر روشن تھی۔ موی کی طرف سے نیا میسج تھا۔ وہی الفاظ پھر سے جگمگا رہے تھے۔

"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" یہ صبح سے پچاسواں میسج تھا۔ وہ اڑتالیس مرتبہ جواب دے چکا تھا، مگر مامن کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تسلی ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جواب ٹائپ کر رہا تھا۔

"بے حد، بے حساب، بے شمار، بے انتہا... جتنے "بے" بچے ہیں۔ ان کو خود لگالو۔ پوری گردان مکمل ہوجائے گی۔" وہ مسکراتا ہوا ٹیکسٹ سینڈ کرکے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جواب آگیا تھا۔

"بے حس، بے خبر، بے درد، بے طریقہ، بے دل، بے ڈھب، بے روح، بے رحم، بے قدرے، بے مروت، بے نیاز، بے ہمت انسان... بس اتنے ہی "بے" میرے پاس محفوظ تھے۔ سب تم پر فٹ آتے ہیں۔ میری محبت کا مذاق اڑاتے ہو۔" مامن نے جواب کلس کردیا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور مسکراتا رہا۔ گویا اس نے مامن کو زچ کردیا تھا۔ جیسا کہ صبح سے مامن نے میسج کر کرکے اسے زچ کر رکھا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"بے ادب، بے تاب، بے خود، بے سلیقہ، بے صبری، بے قابو، بے کل، بے وقوف، خاتون! اتنی نادان اور بے شعور کیوں ہو؟ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ تم میرے لیے انمول ہو۔ محبت اظہار چاہتی ہے، مگر اتنا بھی نہیں... دن کے تین پہر "محبت محبت" کرتا رہا تو فارن سروسز کا خواب "بے دردی" سے چکنا چور ہوجائے گا۔ سو تم مجھے محبت کے جھانسے میں الجھا کر پہلی پوزیشن کے لیے راہیں ہموار نہ کرو۔ تم جانتی

ہو' پہلے نمبر پہ تم ہی ہو۔۔۔"

وہ میسج سینڈ کرکے بے اختیار ہنسنے لگا۔ جانتا تھا کہ آخری بات لکھ کر اس کا غیض بڑھانے کا سامان کردیا ہے۔ اب وہ اس کے میسج کا انتظار کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد جواب فٹ سے آیا۔

"بے ہودہ آدمی' دماغ الٹادیا۔" بہت جلا بھنا جواب تھا۔ آگ بگولا ہوکر لکھا گیا تھا۔ وہ تصور میں مامن کا سرخ چہرہ' غصیلی آنکھیں دیکھنے لگا۔ پھر ان غصیلی آنکھوں میں اسے نمی ابھرتی نظر آئی تھی۔ آنسو' پانی' گرم سیال۔۔۔ عدل کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ بے چین ہوکر سا باہر نکلنے لگا تھا۔ مگر یہ کیا؟ دروازے کے سامنے مامن کھڑی تھی۔ ہاتھ میں فون پکڑے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے ملال نے گھیرلیا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ اس نے مامن کا دل دکھادیا تھا۔

"موی! میں نے تو۔۔۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا' مگر مامن نے اسے موقع ہی نہ دیا۔ وہ اسے بے ساختہ ٹوک گئی۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ درست کہا۔ میں تمہارے لیے انمول ہوں۔ میرے لیے یہ الفاظ انمول ہیں۔ یہ تمہارے لیے۔۔۔ اتنے حسین اظہار کے بدلے میں۔" اس نے پلو ہٹا کر پھول عدل کی ہتھیلیوں پر رکھ دیے۔ تازہ سرخ مہکتے گلاب۔ وہ حیران رہ گیا تھا۔ مامن رو رہی تھی۔ اس کے گالوں پہ شبنم گررہی تھی۔

"پھر یہ آنسو کیوں؟" وہ گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔ انمول ہونے کے آنسو ہیں۔" موی روتے روتے ہنس پڑی۔۔۔ وہ ایسی ہی تو تھی۔ ہنستے ہنستے رو پڑتی' روتے روتے ہنس پڑتی۔ وہ اس کے لیے پاگل تھی' دیوانی تھی۔ ایک ساتھ کھیلتے' کودتے' سائیکلنگ کرتے' کیرم کھیلتے' تتلیاں پکڑتے' جگنوؤں کے پیچھے بھاگتے جانے کب' کیسے' کس طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لیے بندھ گئے تھے اور بظاہر ان دونوں کے ایک ہونے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ تب ہی تو دونوں مطمئن تھے۔ بیچ میں تھوڑا سا انتظار تھا۔ صرف چھ مہینوں پر مشتمل۔۔۔ مامن کے لیے یہ انتظار کیوں آگیں تھا جبکہ عدل کے لیے بھی بے حد لطیف۔ جیسے لمحے لمحے سے خوشی کشید کررہے تھے۔

مامن مسکراتے ہوئے کوریڈور سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں اترگئی۔

آج جاگنگ کا پریڈ بھی مس ہوگیا۔ اب دن چڑھ گیا تھا' ایکسر سائز کا موڈ نہیں تھا۔ وہ تازہ ہوا کھاتا گھومتا کرتے سلیم تک آگیا۔

"سلام صاحب!" سلیم نے اسے دیکھتے ساتھ مؤدبانہ سلام پیش کیا تھا۔

"بابا کی ڈاک تو نہیں آئی؟" وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"آج تو نہیں آئی۔" سلیم نے سوچ کے جواب دیا تھا۔ عدل کچھ پل کے لیے چپ سا ہوگیا۔ پھر کچھ بے چینی سے بولا تھا۔

"اور اس سے پہلے؟" اس کی پیشانی پہ سلوٹیں تھیں۔ ابھی رات کو بابا پھر اپنی ڈاک کے بارے میں پوچھ رہے تھے' وہ خاصے پریشان لگ رہے تھے۔

"ڈیڑھ ماہ پہلے خط آیا تھا۔ اس کے بعد نہیں۔" سلیم نے کچھ دیر ذہن پر زور دے کر جواب دیا تھا۔ عدل کچھ چونک گیا۔ یعنی بابا کے چلے جانے کے بعد؟ تو پھر وہ خط کہاں تھا؟ اسے بے چینی لاحق ہونے لگی۔

"میں اسٹڈی روم میں رکھ آیا تھا۔ صاحب کی میز پر۔" عدل کے پوچھنے سے پہلے ہی سلیم نے وضاحت کردی تھی۔ تب وہ مطمئن ہوکر سرہلاتا اندر چلا آیا۔ اس کا رخ اسٹڈی روم کی طرف تھا۔ اس کا ارادہ تھا' وہ خط پڑھ کے اس کا متن بابا کو ای میل کردے گا۔ وہ خط کتنے اہم تھے' کس قدر قیمتی تھے۔ کوئی اور جانتا یا نہ جانتا تاہم عدل کبیر ضرور جانتا تھا۔

اسے بہت کم سنی میں ہی اپنے بہت کم رشتوں کا احساس ہوگیا تھا۔ ننھیال کے نام پر صرف دو ماموں زاد تھیں۔ اس کے بچپن کی سنگی ساتھی دونوں ہی اس کی ماں کے زیر سایہ پل کے جوان ہوئی تھیں۔ جہاں تک ددھیال کی بات تھی تو وہ اپنے باپ کے رشتے داروں سے نام کی حد تک واقف تھا۔ بابا اسے کبھی مورکھ لے کر نہیں گئے تھے' کیونکہ مورکھ میں بابا کا کوئی رشتہ بچا ہی نہیں تھا۔ صرف ان کی ایک چاچی کے سوا۔

اس کے دادا مہوال کبیر خان تب انتقال کرگئے تھے جب وہ آٹھ سال کا تھا۔ تب وہ پہلی اور آخری مرتبہ مورکھ گیا تھا اور تب کا کوئی دھندلا عکس بھی اس کے ذہن میں تازہ نہیں تھا۔ تاہم اسے ایک ہلکی سی تقریب کا خیال ضرور آتا تھا۔ جیسے وہ کوئی خواب کا سا منظر تھا۔ کچھ لوگ' کچھ باتیں' کچھ چہل پہل۔ اور پھر دادا کی اچانک موت۔۔۔

دادا کے بعد اس کے اکلوتے چچا بلال کبیر بھی انتقال کرگئے تھے۔ چچا کو ٹی بی کا مرض لاحق تھا۔ بابا بتاتے تھے' وہ چند سال بھی جی نہیں پائے۔

اور چچا کے بعد ان کی بیوی جبیں۔۔۔ اسے ددھیال میں جبیں کے علاوہ کسی اور کی صورت یاد نہیں تھی۔ بہت حسین عورت تھی۔ اتنی سفید۔۔۔ اتنی سفید جیسے روئی کے گالے' یا جیسے دودھ میں گھلا ہوا روح افزا۔۔۔ یا گلاب کی پتیوں میں مکھن کی ملاوٹ۔۔۔ وہ بہت حسین عورت تھی' قندھاری انار جیسی۔۔۔ کینسر جیسے مرض میں مبتلا تھی' مگر اتنی جوان اور صحت مند نظر آتی۔ وہ پورے ڈیڑھ سال ان کے گھر میں رہی تھی۔ گاؤں میں اس کا علاج نہیں ہورہا تھا۔ جب اسے بابا اپنے ساتھ لائے تب وہ حیران رہ گیا۔ وہ اتنی حسین عورت اس کے بابا ساتھ کھڑی بہت اچھی لگ رہی تھی' مگر مما کو جانے کیوں اس عورت کی اپنے گھر موجودگی کھٹکتی تھی۔ حالانکہ وہ بیمار عورت تھی اور قطعاً" بے ضرر تھی۔ سارا وقت کمرے میں بند رہتی۔ تنہا' اکیلی' خاموش۔۔۔

تاہم بابا اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسے یاد تھا' بابا جبیں کو آؤٹنگ پہ لے جاتے' گھماتے' پھراتے' باتیں کرتے۔ اس کے چیک اپ' مہنگے ترین علاج' ٹیسٹ' اعلا خوراک کے باوجود جبیں کی خاموشی ختم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ شاید مما کی بدزبانی بھی تھی۔ وہ اسے ہر وقت باتیں سناتیں' طعنے دیتیں' غصہ کرتیں اور وہ چاپ سنتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک صبح وہ اسی خاموشی کے ساتھ گہری نیند سوگئی۔ تب بابا بہت غم زدہ تھے۔ بہت رو رہے تھے۔ انہوں نے عدل کو سینے سے لگا کر بڑے درد بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں اپنا حق ادا نہیں کرسکا۔ میں چاچی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میں جوئی کی ماں کو بچا نہیں سکا۔"

وہ بہت دکھی تھے' بہت افسردہ تھے۔ خود کو جانے کیوں ملامت کررہے تھے۔ پھر اس نے اپنے باپ کو عمر بھر ملال میں ہی دیکھا تھا۔

بابا کی چاچی بہت بدزبان' جھگڑالو اور غصیلی عورت تھیں۔ عمر بھر ان سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ پھر بھی بابا نے مورکھ جانا ترک نہیں کیا تھا۔

اسے اب پتا چلا تھا' کچھ سال پہلے کہ بابا اپنی اکلوتی بھتیجی کے لیے مورکھ جاتے تھے۔ اس نے کبھی بھی بابا کے معمول میں فرق نہیں دیکھا تھا۔ وہ مہینے میں دو مرتبہ لدے پھندے سے گاؤں جاتے۔ مما کی ہزار ناگواری کے باوجود ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک مرتبہ مما نے جل بھن کر کہا تھا۔

"اسے ادھر ہی لے آؤ' پھیرے تو ختم ہوں تمہارے۔" تب بابا کچھ افسردہ سے ہوگئے تھے۔

"کاش کہ چاچی مان جاتیں۔۔۔ میں جوئی کو یہاں بہتر زندگی مہیا کرتا۔ زندگی کی ہر سہولت' ہر آسائش جو اس کے پاس نہیں۔"

وہ بہت رنجیدہ ہوجاتے تھے اور وہ جوئی کے لیے اسی قدر رنجیدہ رہتے تھے۔ ان کے اندر جیسے غموں کا شگاف پڑگیا تھا۔ دل میں کہیں بہت سی درزیں ۔۔۔ اور دراڑیں پڑگئی تھیں اور جب وہ مورکھ سے واپس لوٹتے تب اور بھی شکستہ نظر آتے۔ وہ اپنی چاچی کی عداوت' غصے اور نفرت کے سبب بہت غمگین رہتے تھے۔ جانے ان کی چاچی کا رویہ ایسا کیوں تھا؟

بابا کی ہزار عرضداشت' درخواست اور گزارش کے باوجود ان کی چاچی جوئی کو بابا کے ہمراہ بھیجنے پر تیار نہ ہوتیں۔ ان کی کوئی الگ ہی منطق تھی۔ کبھی بھی

عدل کا بہت دل چاہتا تھا' بابا کو بغیر بتائے مورکھ چلا جائے اور جوئی کو زبردستی اس کی ظالم نانی کے چنگل سے آزاد کر کے ادھر لے آئے۔ یوں کہ بابا جوئی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا۔ وہ بابا کے ان گنے چنے رشتے داروں سے ملے' ان کے رشتوں کے درمیان موجود ہر گرہ' گانٹھ کو کھول دے' مگر کچھ چیزیں اس کے اختیار میں نہیں تھیں۔

وہ اس وقت مسلسل جوئی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کا خط' اس کی طرف سے آیا ہوا خط' جوئی کا لکھا ہوا خط اس کے باپ کی ذات کے لیے کتنا "اہم" تھا۔ عدل کبیر جانتا تھا۔ وہ پیشانی مسلتا اسٹڈی روم کے دروازے تک آیا تھا' جب دائیں طرف سے بولتی ہوئی مامن بھی آگئی۔

☼ ☼ ☼

لفافہ کھولتے ہوئے ان کا فشار خون بڑھنے لگا تھا۔ انہیں لگا۔ ان کی زندگی میں ایک اور جبیں' جوئی کی صورت میں جونک بنی چمٹنے کو بے تاب ہے۔

وہ لب بھینچے تحریر پڑھنے لگیں۔

"پیارے ڈاکٹر چاچو!

سلام اور دعاؤں کے بعد اک طویل حکایت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' کیسے سناؤں اور کیا کیا بتاؤں۔

جو باتیں عمر بھر آپ سے چھپا کر رکھی تھیں۔ آپ کو دکھ نہ ہو' آپ کرب سے نہ گزریں' آپ کو تکلیف نہ ہو۔۔۔ وہ باتیں میرا "حال" چیخ چیخ کر رہا ہے۔۔۔ چاچو! وقت مجھے دوراہے پر لے آیا ہے۔ میرے آس پاس خطرے کے علاوہ کچھ نہیں۔۔۔ میں ڈر اوڑھ کر سوتی ہوں اور خوف کے عالم میں اٹھتی ہوں۔۔۔ میرا وجود بہت سے لوگوں کے لیے بھونڈا' نامبارک' بدشگون اور نحس ہے۔۔۔ میں اپنے اس کرچی کرچی وجود کو لے کر کہاں جاؤں؟ میرا آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔۔۔ میں آپ کے علاوہ کسے پکاروں۔۔۔

ڈاکٹر چاچو! نانی کی سانسیں اٹک رہی ہیں۔۔۔ یہ خط نانی نے لکھوایا ہے۔۔۔ وہ جیسے آپ کے انتظار میں ہیں۔۔۔ نانی نے ضد توڑ ڈالی۔ انہوں نے آپ کو معاف کیا اور یہ خط لکھنے کو کہا۔ وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔۔۔ میری زندگی یہاں بہت تنگی اور بدحالی کا شکار ہے۔ نانی چاہتی ہیں۔۔۔ آپ مجھے یعنی اپنی "امانت" کو ہمیشہ کے لیے لے جائیں۔ اور۔۔۔"

انہوں نے مزید خط پڑھے بغیر ہاتھ میں مروڑ دیا تھا۔ ان کے چہرے پہ نفرت اور سوچ کی گہری پرچھائیاں ابھر آئی تھیں۔

"امانت" وہ زہرخند سی بڑبڑائیں۔۔۔ انہیں جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ جبیں کی بیماری کے دوران ہلال کبیر کا کٹھن چکر بنے رہنا۔ بے حال' پریشان' رنجیدہ نظر آنا۔ چھپ چھپ کر آنسو بہانا پھر جبیں کی موت پہ مہینوں خود سے بیگانہ رہنا۔ گھر' بچے اور اسپتال کو بھول جانا۔

غفیرو کو کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا اور اسی حساب سے ان کے اندر تنفر بڑھتا رہا تھا۔ کسی کی لاچاری' تنگی' بے حالی' بے بسی انہیں کیسے نظر آتی؟ ان کے اپنے ہی کتنا بچے بہت تھے۔ نفرت' غصے اور نظرانداز کیے جانے والے گھاؤ انہیں بھولے نہیں تھے۔

انہوں نے لب بھینچتے ہوئے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی۔ جلد ہی انہیں مطلوبہ چیز نظر آگئی۔ وہ ایک سنہرا لائٹر تھا۔

ڈاکٹر ہلال کبیر کبھی کبھار اسے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے لائٹر اٹھا کر خط کو ایش ٹرے میں رکھا اور پھر کاغذ کے ننھے سے ٹکڑے کو شعلہ دکھا دیا۔ وہ ہر کہانی اور ہر داستان کو مٹا چکی تھیں۔ نئی کہانیاں رقم ہونے سے پہلے ہی بجھ گئیں' راکھ بن گئیں۔ خاک ہو گئیں۔۔۔ وہ کیوں نہ مطمئن ہوتیں۔ معا" دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر آگیا۔ وہ یہ کام رات ہی کرنا چاہتی تھیں' مگر ضروری کالز آنے پر کر نہیں سکی تھیں۔ صبح اٹھ کر پہلا کام یہی کیا تھا۔ اب عدل کو سامنے پاکر حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ مگر اپنی ناگواری' غصہ یا تنفر جتلا کر عدل کو "چونکانا" نہیں چاہتی تھیں۔

"مجھے کیا خبر بیٹا! یہیں کہیں ہو گا۔ سلیم نے کہیں رکھ دیا ہو گا۔ تمہارے بابا خود آکر دیکھ لیں گے' پتا تو ہے' اپنی چیزوں میں گھسنے نہیں دیتے۔" عدل نے خط کے بارے میں پوچھنے پر بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولیں۔ تب وہ سر ہلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی ایش ٹرے پہ نظر پڑی تھی۔

"یہ کیا ہے؟ عجیب سی بو؟ کسی چیز کے جلنے کی؟" اس کی حسیات بہت تیز تھیں۔ وہ فورا" چونک گیا تھا۔ پھر ناک سکیڑ کر سونگھنے لگا' جیسے "بو" کی کیفیت کا اندازہ کر رہا تھا۔ کس چیز کی بو تھی؟ سگریٹ کی؟ کسی اسپرے کی؟ یا پھر؟ اس نے ہلکی سی چٹکی بھر راکھ کو دیکھا۔ پھر ماں کو دیکھا۔ وہ لاپروائی سے سلیم کو کوستی ہوئی ایش ٹرے اٹھا کر ڈسٹ بن میں الٹ آئی تھیں۔

"جب سے تمہارے بابا گئے ہیں۔ اس سلیم کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ اتنے دن سے صفائی ہی نہیں کی۔" وہ زیرِلب بڑبڑاتی ایش ٹرے صاف کر کے عدل تک آئی تھیں۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئیں۔

"یہ موی کہاں رہ گئی؟ چلو تم موی کو آواز دو۔۔۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔۔۔ یامن اور عمیر کو بھی بلا لانا۔۔۔" وہ اپنے تئیں بہت نارمل نظر آرہی تھیں تاہم اندر کہیں گھبراہٹ ضرور تھی۔ کیونکہ عدل کا انداز کچھ بدلا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے خود ہی ماں کو مخاطب کر لیا۔

"مما! بابا اس کے لیے بہت متفکر تھے۔ یہاں ہوتے تو ایک چکر مورکھ کا لگا آتے۔ کیا میں مورکھ جا کر اس کا پتا کر آؤں؟"

عدل نے پُرسوچ' سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے ان سے اجازت چاہ رہا تھا اور غفیرو کے قدموں تلے سے زمین ہل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دھند کے پار ملگجا سا اجالا بکھر رہا تھا۔ دور دھند میں لپٹے پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چوبارے سے آلو بخارے کا باغ بھی دکھائی دیتا تھا۔ ٹنڈ منڈ سے برہنہ درخت' بے پھل کی ٹہنیاں۔ بے پتوں کی اداس شاخیں۔۔۔ باغ کے اس طرف ندی کا پل تھا اور پل کے اوپر ٹریفک رواں دواں تھا۔ سارا وقت گاڑیاں آتی جاتیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ٹینکر آتے۔ کوئی مکھن لینے' کوئی دودھ لینے' کوئی گھی اور پنیر لینے اور کوئی تیار شدہ کھویا اٹھانے۔۔۔ یہاں کا موسم بھی بڑا ضدی' نخریلا اور ہٹیلا تھا۔ نو' دس ماہ گیلا بھیگا' دھند میں لپٹا سرد ہی رہتا۔ گرمی بس مہینہ' دو مہینہ کے لیے آتی' پھر پلک جھپکتے میں پھسل جاتی۔

قصبے کے لوگ اسے برف کا شہر کہتے۔ شاداب' سرسبز' خوب صورت' مگر اداسی میں لپٹا۔ ضروریات زندگی کی ہر سہولت یہاں میسر تھی۔ بازار میں رنگ رنگ کی دکانیں' کپڑا' جوتی' میک اپ سب کچھ باآسانی مل جاتا۔ گاؤں والوں نے اپنی سہولت کے لیے شہر اٹھا کر گلی گلی میں سجا لیا تھا۔

بخت گل کی 'خصلت' میں چلبلا پن اور ظرافت تھی۔ کچھ گھر سے بھی آزادی ملی ہوئی تھی۔ وہ صبح کام پہ آنے سے پہلے ایک چکر بازار کا ضرور لگاتی۔ ہر روز اس کے پلو سے کچھ نہ کچھ بندھا ملتا۔ کبھی انگوٹھی' کبھی چھلا' کبھی بالی' جھمکا' پائل' چین' نقلی سامان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ تب لحہ بھر کے لیے جوئی اپنا کام ترک کر کے بخت گل کی خریداری دیکھنے لگتی۔ وہ حیران ہو کر اس کی چیزوں کو چھوتی' ہاتھ لگاتی' محسوس کرتی' دیکھتی' سوچتی اور چپ سی رہ جاتی' تب بخت گل۔ اس کے گال پہ زور سے چٹکی بھرتی' اس کا ہاتھ دباتی' بالوں کی چٹیا کھینچتی اور اس کے کان پہ جھک جاتی۔

"ایسی چیزیں چاہئیں تمہیں؟" وہ اس کی آنکھیں کھوجتی' چہرہ پڑھتی' رنگ اور حسرت تلاش کرتی۔ وہاں سادگی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ بس اک ہلکا سا شوق کسی چیز کو پانے کی چاہ حاصل کرنے کی لگن' چھیننے کی نہیں' جھپٹنے کی نہیں۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" جوئی ہکلا جاتی۔ گھبرا جاتی۔

"کیوں نہیں؟" وہ اصرار کرتی۔

"میری پہنچ نہیں۔" جوئی ٹال دیتی۔ مگر بخت گل اسے ٹالنے نہ دیتی۔

"یہ کس نے کہا۔" وہ معنی خیزی سے قہقہہ لگاتی۔ گدگداتی، ہنستی مسکراتی، اس کے کان میں گھس جاتی۔

"لاکھوں میں ایک صورت ہے تمہاری۔ کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ ایک دن خان کی دکان پہ چلنا۔ بڑا دل پھینک ہے۔ صورت دیکھ کر ریجھ جائے گا۔ پھر تو سمجھو موجیں ہی موجیں، جو مرضی اٹھا لانا۔ چوڑی، بالی، جھمکا، گجرا۔۔۔ غازہ، مہندی، ابٹن، پاؤڈر، سرخی۔۔۔ لالی۔۔۔ زبان تک نہ ہلائے گا۔ صرف مسکرا مسکرا کر دو چار باتیں ہی تو کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑنے کی بھی جرات نہیں اس میں۔"

بخت گل اسے لالچ دیتی، ابھارتی۔

"اتنی سفید، سرخ، دودھ اور چاندی میں دھلی ہو۔ نظر نہیں ٹھہرتی۔ بانکی سجیلی۔ میرا جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتی رہوں۔۔۔ بھلا مرد ذات کا کیا حال ہوتا ہوگا؟"

بخت گل اسے خود آگاہی کے سبق پڑھاتی۔

"گوشی کے ہاتھ سے تم بچ کیسے گئیں؟ ہائے۔۔۔ کتنی بھولی معصوم ہو۔ خود کو میٹھے لڈوؤں میں ڈبو لیا۔ شیرے میں گم کر لیا۔۔۔ ارے۔۔۔ تمہارا یہ ہنر یہ مہارت کس کام کی؟ فائدے میں سارا جہان ہے اور تم خسارے میں۔ ڈھور ڈنگروں کی طرح کام کرتی ہو۔۔۔ بنا اجرت کے۔ خاک دھول کر دیں گے یہ لوگ تمہیں۔۔۔ دیکھو، مجھ سے سبق حاصل کرو۔۔۔ میں تو تم سے کام سیکھنے کی مدت تک یہاں ہوں۔ کام سیکھنے کی بھی اجرت لیتی ہوں۔ جب مہارت آگئی تو کسی بڑے شہر چلی جاؤں گی۔ اپنی دکان بناؤں گی۔ تمہارے ہاتھ کا ذائقہ چرانا ہے بس۔ پھر تم دیکھنا، میرے وارے نیارے۔۔۔" بخت گل اپنے خواب بتاتی، اپنی خواہش جتاتی اس کی خواہشوں کی کھوج لگاتی اور اس کا جواب بخت گل کو حیران کر دیتا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ایسے "طریقوں" سے تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں اسی حال میں ٹھیک ہوں۔"

جوئی کا جواب اسے بے چین کر دیتا۔ ایسی قناعت پسندی حیران کر دیتی۔

کیسی لڑکی تھی یہ؟ میلے چیکٹ کپڑوں میں بھی ہیرا۔ تھی، چکنائی، شیرے کے دھبوں میں نہاتی۔ الجھے، بکھرے بالوں والی۔ ٹوٹی چپی میں بھی مطمئن۔ رات رات بھر سل پہ دال پیستی۔ سو کلو دودھ میں کڑچھے چلاتی۔ کھویا بناتی۔ پھر بھی "اف" نہ کرتی۔ سب کی گالی، مار، جھاڑ سہتی۔ مڑ کر جواب نہ دیتی۔ ایسا صبر جس کی مثال نہ ملتی۔

اپنی ماں جیسی تھی، صورت، شکل، مزاج، عادت، خو میں گم صم، چپ چاپ، سنجیدہ۔۔۔ تھوڑی جوگی، تھوڑی روگی۔

"اے۔۔۔ اے۔۔۔ اے جوئی!" بخت گل بے چین ہو کر اس کا کندھا ہلاتی۔ اسے متوجہ کرتی۔ پھر سوال کرتی۔

"وہ تیرا خوب صورت چاچا۔۔۔ خوشبوؤں میں بسا۔۔۔ سوٹڈ بوٹڈ اور اس کا لڑکا؟ وہ تجھے اس حال میں قبول کر لے گا؟ وہ شہری، انگریز بابو، پڑھا لکھا، زمانہ ساز۔۔۔ تو معصوم، سادہ، بھولی، دیہاتن۔۔۔" بخت گل کے اکثر سوال اسے ڈس لیا کرتے، عجیب ساڈنک مارتے، زخم زخم کر دیتے۔ آنکھوں میں آنسو گھسیٹ لاتے۔

"اسی کے لیے خود کو بچا بچا کے سینت سینت کے رکھتی ہو نا۔" بخت گل بڑی گھاگ لڑکی تھی۔ عمر میں اس سے چند سال بڑی۔ باتوں میں بہت بڑی اور چالاکیوں میں تو بہت ہی بڑی۔ وہ گم صم ہو جاتی، خلاؤں میں دیکھنے لگتی۔ جواب تلاش کرتی، سوچتی، الجھتی، پھر دھیمے دھیمے بولنے لگتی۔

"مجھے نہیں پتا، لفظوں کی بازی گری مجھے نہیں آتی، مجھے تو بس اتنی خبر ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ نانی نے مجھے یہی سمجھایا۔ میری ماں بہت اچھی عورت تھی، مگر خائن بھی تھی۔ میرے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس سے محبت نہ کر سکی۔ بس ایک چپ کی بکل میں سارے جذبوں کو سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا۔۔۔ میں جس کی ہوں، اسی کی رہوں گی۔ عمر بھر کے لیے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔۔۔ میں نہ جذبے بدلوں گی نہ محبت۔"

بخت گل گویا دنگ رہ جاتی، کچھ لمحے بول ہی نہ پاتی۔

سیاہ پڑتی رسوئی کی چھت کو دیکھتی وہ جانے سوچ کی کن کن بھول بھلیوں میں گم تھی جب لکڑی کے زینے پہ کسی کے پیر دھرنے کی آواز آئی تھی۔ جیسے زینے سے لٹکی زنجیر بجنے لگی۔ کہر میں لپٹی اس سویر کون گرم لحاف سے نکل کر اوپر آ رہا تھا؟ گوشی خان یا پھوپھی؟ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ سامنے بخت گل کھڑی تھی۔ بظاہر اس کی مدد کے لیے آئی تھی، مگر گوشی سے اجرت بھی لیتی اور کام بھی سیکھتی۔ اس وقت بھی کام کے لیے آئی تھی۔ گرم اونی شال اوڑھے نئی نکور چمکتی شال، جیسے ابھی خریدی گئی ہو، نرم فر والی۔ ہری گھاس جیسا سوٹ پہنے، ویلوٹ کا، نرم ملائم، اور سب سے خوب صورت پیروں کی چپی۔ اصلی لیدر کی، جانے کتنی مہنگی تھی؟ بخت گل اس کی آنکھوں میں اتری ستائش کھوج گئی۔ تب ہی تو بلاوجہ اترانے لگی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں!" خان نے تو بہت تعریف کی۔ یہ سب وہی لایا تھا باڑے سے۔ ایک دم امپورٹڈ۔۔۔" وہ چہک رہی تھی۔

سجنے سنورنے کی شوقین تھی۔ اس وقت لگ بھی کمال کی رہی تھی۔ تر و تازہ سی، مہکتی ہوئی۔ خوشبو میں بسی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ جوئی کو عجیب سی گھن آنے لگی، عجیب سی کراہیت کھانے لگی۔ اسے وہ بدبو میں لپٹی نظر آئی۔ گندی اور غلیظ سی مسکراہٹوں اور جذبوں کی ساہوکارن۔۔۔ جوئی کا جی اوب گیا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔

"میری بات مان لے جوئی! ڈھنگ کے کپڑے مل جائیں گے۔ یہ پانچ سالہ پرانا سوٹ اتار پھینکنا اور یہ ٹوٹی چمڑے کی چپی۔۔۔ اسے کوڑے میں الٹ آنا۔ زندگی کا مزہ یہی ہے۔ مفت میں بے شمار سہولتیں۔۔۔ مزے ہی مزے۔"

بخت گل اپنی فہم کے مطابق پرجوش ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی اور سیدھی سادی راہوں کو پسند کرتی تھی۔ اس کی نانی بہت جھگڑالو عورت تھی، بہت بد زبان، غصیلی، تنک چڑھی۔۔۔ پھر بھی جوئی کی ایسی تربیت کر گئی کہ کسی بھی مقام پر اس کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے تھے۔ نانی کو اس کی ماں کا بہت دکھ تھا۔ وہ اسے یاد کر کے بہت روتی۔ اس کی جوانی پہ تڑپتی۔۔۔ مگر نانی کو ماں سے شکوے بھی بہت تھے۔ کبھی کبھار نانی کے منہ سے کوئی انہونی بات پھسل جاتی۔

"جبیں نے دل کو روگ لگا لیا تھا۔ یہی روگ اس کی جان لے گیا۔ تو دل کو روگ نہ لگانا۔" وہ ہر لمحے اس کی استانی بنی رہتی۔۔۔ اسے زندگی کے اتار چڑھاؤ کی رمزیں سمجھاتی۔ جوئی اس کی باتیں بہت غور سے سنا کرتی تھی۔ پھر ان کو پلو سے باندھ لیتی۔

"نکاحی عورت کسی اور کو سوچے بھی تو گناہ۔۔۔ ارے پچھلے نشان مٹانے پڑتے ہیں۔ یاد رکھ، نکاح سے بڑھ کر کوئی بندھن نہیں۔ اس سے پہلے کے سب بندھن کچے، منگ ٹھکرائی جا سکتی ہے منکوحہ نہیں۔۔۔ بس ہم سے کچھ نادانیاں ہو گئیں۔۔۔ اس تقصیر کی "پکڑ" ہیں ہیں۔"

نانی منہ پہ اونی ٹوپا رکھ کے رونے لگتیں۔ جانے ان کو کیا کچھ یاد آ جاتا تھا۔ تب ان کی ذہنی رو بھٹک جاتی اور وہ جوئی کے دیوتا کو کوسنے لگتیں۔

"مجھے نہیں اس پر اعتبار۔۔۔ مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ میں کیسے اعتبار کروں؟" بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا تھا۔ ڈگریاں، میڈل، تمغے، ہاتھ کیا آئے، سب بھول گیا۔۔۔ کیسے یقین کر لوں کہ وہ پھر سے دھوکا نہ دے گا۔"

نانی اونچی آواز میں خود کلامی کرتیں، غصہ کرتیں اور ڈاکٹر چاچو کو گالیاں دیتیں۔ پچھلے چودہ سال سے وہ نانی کو اپنے مخلص ہونے کا یقین دلا رہے تھے، مگر نانی کو یقین ہی نہ آتا۔ جب بھی نانی ان کے نہ آنے کا طعنہ دیتیں۔ جوئی ننھا سا خط لکھتی اور خط ملتے ہی ڈاکٹر چاچو سارے ضروری کام چھوڑ کر بھاگے چلے آتے۔ پچھلے

چودہ سال سے کوئی وقت کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ جوئی کے کہنے پہ ادھر نہ آئے ہوں۔

وہ کبھی بھی اپنی ذمہ داریوں سے نہیں بھاگے تھے۔ جب بھی آتے اس کے لیے رنگ رنگ کے کپڑے لاتے' جوتے' کھلونے' رنگ برنگے کھانے' چاکلیٹس کے ڈبے' ٹافیوں کے پیکٹ' کتابیں' بیگ' کلرز' سائیکل' جھولا اور بے شمار پھلوں کے ٹوکروں سے لدے آتے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی واپسی کی مدت تک یہ سب سامان جوئی کے پاس رہتا۔ ان کی گاڑی پل کی حدود سے نکلتی اور مامی کسی جن کی طرح ہر شے کو جھپٹ لیتی۔

جوئی کو یاد تھا' پچھلے چودہ سال سے ڈاکٹر چاچو کا لایا ہوا ایک جوڑا بھی اسے پہننا نصیب نہیں ہوا تھا۔۔۔ ہاں اس کے نصیب تب جاگتے جب مامی کی چھوٹی دونوں بیٹیاں اس کی چیزیں پہن پہن کر بے کار کر دیتیں۔ تب وہ کپڑے اور جوتے اس کے حصے میں آتے۔ اسے یاد تھا۔ چاچو اس کی بدحالی پہ کتنا حیران ہوتے تھے۔ اسے نہانے اور کپڑے بدلنے کا کہتے' اسے صفائی کے بارے میں سمجھاتے۔ تب مامی دکھاوے کے طور پہ اسے کھینچ کھانچ کے غسل خانے میں لے جاتی۔ رگڑ رگڑ کے جھانواں استعمال کرتے ہوئے وہ مسلسل اسے دھمکاتی رہتی تھی۔

"چاچا کو کچھ بھی بتایا تو ابلتے دودھ والے کڑاہے میں پھینک دوں گی۔ اپنی زبان بند رکھنا۔" مامی اس کی آنکھوں میں صابن گھسا دیتی۔ اسے چٹکیاں بھرتی' بازو دبوچتی۔ ناخن چبھوتی اور زبان بندی کا حکم دیتی۔ جوئی فرمانبرداری سے درد کی ٹیسیں دباتی' سسکاریاں بھرتی اثبات میں سرہلائے جاتی تھی۔ پھر بھی چاچو کی جہاندیدہ نظریں بہت کچھ کھوج لیتی تھیں۔ وہ اس کی سوجی آنکھوں اور کمزور وجود کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔

وہ ہر دفعہ نانی سے طویل بحث کرتے' کبھی کبھار جھگڑ بھی پڑتے۔ ناراض بھی ہو جاتے۔ پھر بھی جوئی کو اپنے ساتھ لے جانے پر نانی کو منا نہیں سکتے تھے۔ نانی کی ضد اٹل تھی۔ انہوں نے قسم کھائی تھی چاچو سے سیدھے منہ کلام نہ کریں گی اور ڈاکٹر چاچو کے حوالے جوئی کو کبھی نہ کریں گی۔

جوئی نے ڈاکٹر چاچو کو نانی سے بحث کے دوران کئی مرتبہ روتے دیکھا تھا۔ وہ نانی کے پیر پکڑ کر معافی مانگتے۔ اپنے ناکردہ گناہ پہ تڑپتے' روتے پھر بھی نانی کا دل ذرا نہ پسیجتا تھا۔ وہ چاچو سے عمر بھر کے لیے متنفر تھیں اور جوئی کے حوالے سے ان پہ اعتبار نہیں کرتی تھیں۔

"میں اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔" نانی کا ایک ہی جواب تھا۔ چاچو کی ہر دلیل بیکار جاتی۔ وہ ان کی توجہ اس کی بدحالی کی طرف دلاتے۔ جوئی کے پاس نہ اچھا ماحول تھا نہ خوراک تھی' نہ اس کی صحت تھی' نہ اس کے پاس تعلیم تھی۔ نہ اس کے پاس اچھا لباس تھا۔ وہ نہ بھی بتاتی تب بھی ڈاکٹر چاچو فہم رکھتے تھے۔ وہ جوئی کے کمزور' سہمے سہمے خوف زدہ سے وجود کو دیکھ کر گھر والوں کے رویوں کی گہرائی سمجھتے تھے۔ مگر وہ اپنی بھتیجی پہ جیسے کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔

جوئی کی نانی ضدی' تند خو' سخت غصے والی خاتون تھیں۔ گزری باتوں کو کبھی نہ بھلانے والی۔ عمر بھر کے لیے جیسے انہوں نے ہلال کبیر کو معتوب ٹھہرا دیا تھا۔

وہ ہمیشہ نانی سے بحث میں ہار کر واپس لوٹتے تھے' تھکے ماندہ' ٹوٹے بکھرے بے حال سے نڈھال سے۔ تب جوئی کا دل چاہتا۔ وہ بھاگ کر چاچو کی ٹانگوں سے لپٹ جائے انہیں روک لے یا خود ہی زنجیر توڑ کر ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی جائے۔ اس دکھ بھری' پُراذیت زندگی سے چھٹکارا پالے۔

اسے کہر زدہ سی ایک' بہت پرانی سہ پہر یاد تھی' جب اچانک چاچو بنا اطلاع کے آگئے تھے۔ حالانکہ اکثر وہ پڑوس میں فون بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر تب وہ اچانک آگئے مہینے میں تیسری دفعہ اور کبھی کبھی وہ مہینے میں چار مرتبہ بھی چکر لگا لیتے تھے پھر بھی نانی طعنے دینے سے باز نہیں آتی تھیں۔ ان کا دل دکھانے سے خود کو روک نہیں پاتی تھیں۔ اس سہ پہر اسکول سے آکر جوئی کو مامی کے ساتھ بہت کام کرنا پڑا تھا تب وہ بخار میں پھنک

رہی تھی۔ اسے بیٹھے بیٹھے بھی چکر آتے' آنکھیں نیند سے بوجھل بند ہونے لگتیں۔ وہ کبھی دائیں لڑھکتی کبھی بائیں۔ تب مامی کا زوردار تھپڑ اسے ہوش میں لے آتا تھا۔ وہ میدہ گوندھتی روئے چلی جاتی۔

مامی بڑی دو رنگی عورت تھی' مکار' منافق اور چالاک۔ چاچو کی کار کو پھاٹک پہ دیکھ کر اسے گھسیٹتی زینہ اتارنے لگی۔ تب زنجیر نے بج بج کے اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ مامی چاہتی تھی اسے جلد از جلد غسل خانے میں دھکیل دے۔ اس کے میلے چیکٹ کپڑے بدل دے اور اس کا سرخ زکام زدہ منہ دھلوا دے۔ مگر مامی کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں۔ تب چاچو نے اسے قابل رحم حالت میں لیا۔ ان کا دل جیسے پھٹ گیا۔

ان کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں۔ وہ بھاگتے ہوئے جوئی تک آئے تھے تب ان کے ہاتھ سے بھاری شاپرز گرتے چلے گئے۔ پورا صحن سرخ لوکاٹ سے بھر گیا' بڑے بڑے تھیلوں کے منہ کھل گئے۔ جوس کے ڈبے دودھ کے ڈبے مٹھائی' کیک' امرتی جلیبی' نان خطائی' کئی طرح کے مربے..... جیسے ہر طرف بوتلیں ہی بوتلیں بکھر گئیں۔ وہ اس کی کمزوری دور کرنے لیے اعلا سے اعلا خوراک لاتے۔ مگر وہ جانتے نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ بھی اس کے نصیب کا نہیں ہوتا تھا۔

چاچو نے تب اس کے گندے سندے ہاتھوں کو چوما' اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ اس کے گال سے آنسو پونچھے۔ تب وہ چاچو کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے سوچا' یہ وقت یہیں تھم جائے۔ چاچو نے اسے دوا لا کر دی۔ اس کا منہ دھلوایا۔ اپنے ہاتھ سے انڈا کھلایا۔ دوا کھلائی اور پھر نانی سے طویل "جنگ" کی۔ پہلی مرتبہ چاچو نے اپنی آواز کو بلند کیا تھا۔ پوری رات جھگڑا ہوتا رہا۔

وہ لحاف میں دبکی سنتی رہی۔ بالآخر فجر کے قریب بحث تمام ہوئی۔ نانی جیت گئیں' چاچو ہار گئے۔ نانی کی وہ آخری شرط۔ جوئی کو آج بھی وہ الفاظ یاد تھے۔ وہ الفاظ بھلا کیا تھے؟

"اپنے وعدے کے مطابق دستور کے مطابق لے کر جاؤ۔۔۔ ایسے نہیں بھیجوں گی۔" نانی کی آخری شرط پہ چاچو ہار گئے تھے۔ تب ہی تھکے ماندے لہجے میں افسردگی سے بولے۔

"ٹھیک ہے۔ تب تک کے لیے انتظار کریں۔۔۔ میں بھی کرتا ہوں۔ ابھی یہ بہت کم سن ہے۔ کچھ سال پل صراط سے گزرنا ہی پڑے گا۔ پھر وہ وقت دور نہیں' جب میری بیٹی میرے باغ میں چہکتی نظر آئے گی۔ ایسی غم زدہ دکھی اور نڈھال نہیں ہوگی۔"

وہ آنکھوں میں کرچیاں لیے پلٹ گئے تھے۔ تب ان کے الفاظ جوئی کے دل پر نقش ہو گئے۔ اسے ایک آس کے جگنو نے جیسے باندھ لیا۔ ایک خواب' ایک امنگ' ایک امید۔ وہ دن' ہفتے مہینے اور سال گننے لگی۔ جانے وہ وقت کب آنے والا تھا جب نانی بخوشی اسے چاچو کے ہمراہ بھیج دیتیں۔

اس کی اقنوم (بنیاد) ڈاکٹر چاچو کے وجود سے تھی۔ بس یہی بات نانی سمجھ نہ پائیں اور جب انہیں سب سمجھ میں آیا' تب وقت ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔

جب مامی نے اس کی دسویں جماعت کی کتابیں اور بستہ جلا دیا۔ جب زندگی اس کے لیے کڑاہے کے نیچے جلتی آگ اور دھواں بن گئی۔

جب وقت نے اسے بے اماں کر دیا تھا۔ جب حالات کی زوردار آندھی اس کے سر پر رکھی عزت کی اوڑھنی کو اڑانے لگی۔ جب آتی جاتی ہوائیں تک مخالف' بیری' بدخواہ اور رقیب بن گئیں۔

انسان کے خیال اور ادراک کے درمیان ایک مسافت ہے جسے اس کی آہ پُرشوق کے سوا کوئی طے نہیں کر سکتا اور وہ دھیرے دھیرے خیال سے ادراک تک کا سفر طے کر رہی تھی۔ اندر سے چاہے وہ روز ٹوٹتی' روز بکھرتی۔ مگر بظاہر روزمرہ زندگی کے ہر کام کو گھسیٹ رہی تھی۔ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر چاچو بغیر بتائے اتنی مدت کے لیے غائب ہوئے تھے۔ نجانے وہ کہاں تھے؟ ٹھیک بھی تھے یا نہیں؟ اس کا نازک دل خدشوں کا مارا' ہر وقت کانپتا رہتا۔

وہ غائب دماغی سے گھی کا کنستر کڑاہے میں الٹنے لگی تھی۔ تب بخت گل گہرا سانس کھینچ کر جوئی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی تمام تقریر بے کار گئی تھی۔

پوری رات جاگ کر جوئی بوندی کے لڈو تیار کرنے کی ابتدائی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ پھولی چنے کی دال کو پیس لیا تھا۔ ململ کے باریک کپڑے میں چھان بھی لیا تھا۔ پسی ہوئی دال میں دیسی گھی ڈال کر حل بھی کر لیا تھا۔ اب وہ دہی کا ڈرم' دودھ اور بیکنگ پاوڈر بھی الٹ رہی تھی۔ پھر پورے وجود کی طاقت صرف کر کے اسے پھینٹتی رہی۔ بہت بڑا تانبے کا ٹب تھا۔ جس میں آمیزہ خمیر کی طرح پھولا نظر آنے لگا تھا۔

بخت گل نے اتنی مہربانی کی کہ چاشنی تیار کر دی۔ سرخ کھانڈ کی چاشنی دیکھنے میں بھی بہت بھلی لگتی تھی اور اس تمام آمیزے میں گوشی کی ہزار کوششوں کے باوجود جوئی نے ذرا بھی ملاوٹ نہیں کی تھی کھانڈ کی جگہ گڑ ڈالا' نہ دیسی گھی کی جگہ ڈالڈا استعمال کیا اور نہ دال میں ناقص بیسن کی ملاوٹ کی تھی۔

جوئی موٹے چھید والی لوہے کی چھلنی گرم گھی والے کڑاہے پہ رکھ رہی تھی پھر بخت گل تیزی سے چھلنی میں آمیزہ گرا کر بوندیاں بنانے لگی۔ چھلنی سے بوندیاں گھی میں گرتی جا رہی تھیں۔ جوئی پھرتی سے بوندیاں نکال کر شیرے میں ڈالتی جا رہی تھی۔ اگلے تین گھنٹے میں سرخ سرخ بوندیاں تیار ہو کر شیرے میں غرق ہو گئیں۔

اب ٹھنڈا ہونے پر الائچی کے دانے ملا کر وہ لڈو بنا رہی تھی۔ بہت پھرتی اور مہارت سے۔ بڑے ماہر ہاتھ تھے۔ ایک ہی سائز کے گول گول لڈو بناتے' ذائقے دار' خوشبو دار' لذیذ' خستہ صفائی' ستھرائی کے خصوصی خیال کے ساتھ بخت گل کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ وہ کسی ماہر حلوائی کی طرح ہتھیلی پہ بوندیوں کے آمیزے کو رکھتی' آٹے کے پیڑے کی طرح گھماتی' چاندی کا ورق چپکاتی اور لڈو تیار۔ بہت میٹھا' ملائم' دانے دار' ذائقے دار..... بخت گل کے منہ میں شیرا گھل گیا۔ مٹھاس بھر گئی۔

"کاش! میں تمہاری طرح لڈو بنانا سیکھ جاتی۔" بخت گل حسرت زدہ لہجے میں بولی تھی۔ جوئی نے آنکھ اٹھا کر بخت گل کے تکوں والے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"اپنی نیت خالص کر لو' مہارت حاصل کر لوگی۔" وہ لڈو بناتی جا رہی تھی۔ نیچے زمین پر پلاسٹک کی شیٹ بچھی تھی۔ جس پر لڈو ہی لڈو ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

"پر تمہیں بھلا اس ہنر کی کیا ضرورت؟ اگر تو قسمت نے ساتھ دیا تب تم اپنے چاچا کے پاس چلی جاؤ گی۔ وہاں ایسی مشقت نہیں ہوگی۔ تمہارا چاچا تو بہت امیر ہے۔ مہارانی بن کر رہو گی۔ گاڑی میں سفر' کوٹھی میں قیام۔ اعلا ملبوسات تم تو سر تاپا بدل جاؤ گی۔ مگر مجھے نہیں لگتا' تمہاری ماں سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نکلنے دے گی۔ لکھوا لو' تمہارا زبردستی نکاح پڑھوا دے گی گوشی خان' عرف بے ایمان سے۔"

لمحہ بھر کے لیے جوئی بھونچکی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں صدمے کی شدت سے پھٹ پڑیں۔

بخت گل کو اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی زرد رنگت کو دیکھ کر فوراً" بات بدلنے لگی' اس کی توجہ ہٹانے لگی۔ گفتگو کو دوسری سمت لے جانے لگی۔

"گوشی خان مال کو منڈی لے جائے گا؟" یہاں مٹھائی کی منڈی بھی لگا کرتی تھی۔ تھوک فروشی کا بازار تھا' تجارت گاہ' بڑا بازار..... جب گوشی کو آرڈر نہیں ملتے تھے تب وہ مال کو منڈی میں لگا آتا تھا۔ مگر اب صورت حال مختلف تھی۔ اسے آرڈر پہ آرڈر ملتے۔ کام عمدہ ہوتا اور معیاری بھی۔ سو گوشی خان کے وارے نیارے تھے۔

"نہیں..... آرڈر پہ تیار کیا ہے' تم شاید بھول گئیں' بتایا تو تھا۔" وہ ٹب کے کناروں سے چمٹا آمیزہ اٹھا کر لڈو بنا رہی تھی۔ کام تمام ہو چکا تھا۔ اس نے پیندے سے لگے آمیزے سے لڈو بنائے اور بخت گل کو تھما دیے۔

"اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے لے جانا۔"

وہ آہستگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھوئے قمیص کے دامن سے ہاتھ پونچھے۔ اپنی تھکی تھکی سرخ آنکھوں کو ہاتھوں سے دبایا۔ اس کا انگ انگ تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ بخت گل کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ کتنی ـــــ اجاڑ' ویران لگ رہی تھی۔ جیسے وقت نے اس پر شادابی چھوڑی ہی نہیں تھی۔

بخت گل نے لڈو سے بھرا شاپر دائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور ایک شکر گزار نگاہ جوئی کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ اب وہ گھر جانے کے لیے تیار تھی۔ معاً "لکڑی کے زینے پر بھاری قدم پڑنے لگے تھے۔ زنجیر چھن چھن' ٹھک ٹھک بجنے لگی تھی۔ اوپر کون آرہا تھا؟ جوئی کی آنکھوں میں سراسیمگی اتر آئی۔ اس نے بخت گل سے کہنا چاہا۔ "شاپر اپنی شال کی بغل میں کرلو۔" مگر کہہ نہ سکی۔ کچھ اسے اشارہ کرنے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا اور گوشی خان اسی اثنا میں رسوئی تک آ گیا۔

پہلی نگاہ اس کی پلاسٹک کی شیٹ تک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حرص چمک اٹھی۔ مال تیار تھا۔ اور عمدہ ترین لگ رہا تھا۔ سارے ماحول پہ بوندی کے لڈوؤں کی مہک چھائی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس کھینچنے لگا۔ پیسوں کا جوڑ توڑ کرنے لگا۔۔۔ نفع و نقصان سوچنے لگا۔ بچا ہوا راشن دیکھنے لگا۔ دال کے ڈرم' شکر تری کی بوریاں' گھی کے کنستر۔۔۔ دودھ' دہی' بیکنگ پاؤڈر کے ڈبے۔ سامان بہت کم رہ گیا تھا۔ بہت وافر استعمال کیا گیا تھا۔ گوشی خان کو گھاٹے کے اندیشے کاٹنے لگے۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں' وہ اس وقت بپھرا ریچھ لگ رہا تھا غضب ناک' خوفناک' بھیانک۔۔۔

"کم بختی آگئی میری۔۔۔ رات نیند نے دھت کر دیا تجھے دیکھنے نہ آسکا۔ یہ کیا غضب ڈھایا ہے۔ دیسی گھی کے کنستر خالی کر دیے۔ ارے' اس میں ڈالڈا تیرے باپ نے ملانا تھا یا نانی نے؟ تجھے قبر سے اٹھ کر سمجھاتی گڑ کو ہاتھ میں نہ لگایا۔ شیرہ شکر تری کا بنا لیا۔ اتنی مہنگی کھانڈ ضائع کر دی۔ دودھ' دہی' پاؤڈر سب تباہ کر دیا۔ میں خسارے میں گیا۔ برباد کر دیا تجھے۔"

وہ دھاڑتا ہوا تھر تھر کانپتی جوئی تک گیا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ کمزور' بے جان' بے سانس بت کی طرح لڑکھڑاتی کڑاہے کے قریب جا گری تھی۔ بخت گل بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ جوئی کی درگت کا یہ منظر پہلی مرتبہ اس کی نظر کے سامنے سے گزرا تھا۔ اسے جوئی کی حالت پہ ترس آیا۔

"جی چاہتا ہے' تجھے اسی کڑاہے میں الٹ کر بھون دوں۔ ذلیل' مکار' نکمی' میرا کباڑا کر کے رکھ دیا۔" گوشی خان نے دو تھپڑ اس کے گالوں پہ مارے۔ جوئی کے ہونٹ اور گال سے خون رسنے لگا تھا تب بخت گل سے رہا نہ گیا۔ وہ بپھر کر گوشی خان کے سامنے آگئی تھی۔

"ظالم! زور آور۔۔۔ کیوں اس معصوم کی آہ لیتا ہے۔ بے رحم درندے! اس معصوم کی حالت دیکھ۔ رات بھر مشقت کرتی رہی ہے۔ اتنی بھینس جیسی بہنیں گھر میں باندھے ہوئے ہے۔ ان سے کام کروایا کر۔ وہ بستر توڑتی' رزق اجاڑتی نظر نہیں آتیں۔ اس بے زبان یتیم کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ ایک تو تیری چاکری کرے۔ تیری مفت کی نوکرنی رہے اوپر سے تُو اسے مارتا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر' تیرے مرد ہونے پر۔۔۔" بخت گل تو آگ بن گئی تھی۔ گوشی خان جیسے لمحہ بھر کے لیے سناٹے میں رہ گیا تھا۔ ایسا طمانچہ ایک دو ٹکے کی لڑکی نے اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ جوئی کو چھوڑ کر بخت گل پہ چڑھ دوڑا تھا۔

"حرام زادی! تیری جرات کیسے ہوئی؟ زبان چلاتی ہے؟ بکواس کرتی ہے؟ تیرا حقہ پانی بند۔ کل سے یہاں مت آنا۔۔۔" گوشی خان بپھر کر بول رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو کرچھا اٹھا کر اس بد زبان کا سر پھاڑ دیتا۔

"میں خود بھی تھوکنے نہیں آؤں گی۔" بخت گل نے دو بدو جواب دیا تھا۔ تب ہی گوشی خان کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر پہ پڑی تھی۔ وہ جیسے پھر سے ابل پڑا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو یہاں یہ سخاوتیں چل رہی ہیں۔ دو کلو لڈو آرام سے پکڑا دیے۔ تیرے باپ کا لنگر جاری ہے کیا؟ بڑی آئی خدا ترس' میری غیر موجودگی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اماں تو بستر سے اٹھتی نہیں اور یہاں مجھے کنگال کیا جا رہا ہے۔۔۔ دے ادھر شاپر۔" گوشی خان جوئی پہ پھنکارتا بخت گل کی طرف بڑھا تھا۔ تب وہ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی حقارت سے بولی تھی۔

"یہ لے۔۔۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تجھ پر' تیری چیزوں پر' اس مہینے کی اجرت تجھے خیرات سمجھ کر بخشی' اب نہیں آؤں گی اور دعا کروں گی کہ یہ بد نصیب بھی تم لوگوں کے چنگل سے آزاد ہو جائے۔۔۔"

بخت گل نے غضب ناک ہو کر کہا تھا۔ وہ بہت منہ پھٹ تھی۔ جوئی کو آج اندازہ ہوا تھا' وہ حق بات کہنے سے ڈرتی نہیں تھی۔ جوئی کو اس کی بہادری پہ رشک آیا تھا۔ وہ بکتا جھکتا دفعان ہو گیا تھا۔ تب بخت گل نے آگے بڑھ کر سسکتی ہوئی جوئی کو اٹھایا۔ اس کے منہ سے بہتا خون صاف کیا۔ اسے پانی پلایا۔ انگیٹھی سلگا کر پاس بٹھایا۔ پھر وہ اس کے تھکے تھکے ہاتھوں کو دباتے ہوئے نرمی سے بولی تھی۔

"خود کو ضائع مت کر جوئی! اپنے چاچا کو تار لکھ انہیں حالات بتا اور یہاں سے چلی جا۔ ورنہ یہ درندے تجھے کچا نگل جائیں گے۔" وہ بہت مخلصانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے وہ اس لڑکی کی "فطرت" سے گھن کھا رہی تھی۔ اسے کراہیت آرہی تھی اور اس وقت وہ جیسے اپنی لمحہ بھر کی سوچ پہ پشیمان تھی۔ بخت گل جو بھی تھی اس کا جو بھی کردار تھا۔ مگر وہ اپنے سینے میں انسانیت سے بھرا دل ضرور رکھتی تھی۔

"بخت گل! تم جانتی ہو' میرے پاس موبائل فون کی سہولت نہیں۔ پر نمبر ضرور ہے۔ میرے ڈاکٹر چاچو کا نمبر۔ میں وہ نمبر تمہیں دیتی ہوں۔ تم میرے چاچو سے کہو' وہ مجھے لینے آجائیں۔" وہ دھیمی بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور پرانی ماربل کی اینٹوں اور کاٹھ کباڑ سے بھرے صندوقچے سے ایک میلی کچیلی چٹ نکال لائی۔

"جوئی! نانی کا فیصلہ تیرے حق میں اچھا نہ تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں تجھے تیرے چاچا کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ یہاں تیری زندگی کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔" بخت گل نے چٹ شال کے پلو میں باندھ لی تھی اور اسے آلو بخارے کے باغ میں ملنے کو کہا تھا۔ وہ اب دوبارہ اس گھر میں آنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

ڈاکٹر چاچو نے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جانے وہ کہاں تھے؟ ٹھیک بھی تھے یا نہیں؟ پہلے اکثر پڑوسیوں کے گھر فون کر لیتے تھے۔ مگر زیادہ اسے خط ہی لکھتے۔ کیونکہ جوئی خط میں تفصیل لکھ دیتی تھی۔ فون پہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اسے اپنا نمبر دے رکھا تھا۔ مگر جوئی کبھی بھی فون کرنے کی جرات نہیں کر سکی تھی۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی' وہ ہمیشہ دوسروں کی انگلی پکڑ کر ہی چلتی رہی تھی۔ پہلے نانی پھر چاچو اور چاچو اس کے بہترین رہبر تھے۔

وہ رات بھر کی تھکن بھول گئی تھی۔ گوشی خان کے ہاتھوں ملنے والی ذلت بھول گئی تھی۔ مار بھول گئی تھی۔ یاد رہا تو بس اتنا۔۔۔ اگر چاچو ہی نہ رہے تو وہ کہاں جائے گی؟

ان کی فیملی کو تو اس کا خیال نہیں آسکتا تھا۔ وہ لوگ اس کے وجود سے ناواقف تو نہیں تھے مگر اس سے کوئی انسیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ جانے تقدیر میں کیا لکھا تھا؟ اور ہر آنے والا دن اس کے لیے کتنی ذلت لانے والا تھا؟

بخت گل کے نہ آنے سے کام بڑھ گیا تھا۔ وہ تھک کر ٹوٹ جاتی' نڈھال ہو جاتی۔ رونے لگتی۔۔۔ مگر یہاں کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ کشی اور دی ہڈ حرام تھیں' ماں ازل سے کاہل۔ پھر مفت کی نوکرانی کے ہوتے ہوئے انہیں ضرورت کیا تھی کام کرنے کی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا' وہ کھویا بھی بناتی لڈو بھی۔ مگر باڑے کا بوجھ بھی اس پہ آلدا۔۔۔ وہ جانوروں کو

چارہ بھی ڈالتی، پانی بھی پلاتی، ان کی غلاظت بھی صاف کرتی۔ پھر گوشی خان کو باڑے کے لیے بندہ مل گیا تب جوئی کی بدبو کی بھبکوں سے جان چھوٹ گئی تھی۔ مگر اس کی جان چھوٹی کہاں تھی۔ ایک مرتبہ پھر عسمی بچہ پیدا کرنے کے لیے آگئی بمعہ اپنے اوباش شوہر کے۔ عسمی کا یہ پانچواں بچہ تھا۔۔۔ اور جوئی کے لیے یہ بھی امتحان بن کر آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جاؤ گے مورکھ۔۔۔؟" غفیرو کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ سختی سے عدل کو منع کرنا چاہتی تھیں مگر جانے کیوں رک سی گئیں۔ اس سے وہ برہم بھی ہو سکتا تھا اور باپ سے ڈائریکٹ بات بھی کر سکتا تھا۔ تب ان کی پوزیشن شوہر اور بیٹے کی نظر میں خراب ہو سکتی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ ان کی ناگواری کو سمجھ گیا تھا تاہم وہ اپنی ماں کے اندر اٹھنے والے زہریلے پن سے ناواقف تھا۔ سو انہیں خود کو نارمل رکھ کر عدل کو روکنا تھا اور یہ کام کٹھن یا دشوار نہیں تھا۔ عدل فطرتاً "نہ ضدی تھا نہ ہٹیلا۔۔۔ بہت حد تک فرماں بردار تھا اور ماں سے قریب تر۔

"میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں، میں خود جاکر پتا کر آؤں؟ بابا بہت متفکر ہیں۔ شاید ان کا قیام کچھ اور طویل ہو جائے۔" عدل نے سادگی سے پوچھا۔ انہوں نے نظر بھر کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ عام دنوں میں بھی بہت مصروف رہتا تھا اور ان دنوں تو اس کے مقابلے کے امتحان ہونے والے تھے۔ اس کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اس نے جاگنگ، ایکسرسائز، کلب، جم سب چھوڑ رکھا تھا۔ امتحانات سر پہ تھے اور وہ باپ کے رشتے داروں کے لیے متفکر تھا۔ کیا یہ معمولی بات تھی۔

"مگر میری جان! تمہارے بابا ایسا نہیں چاہیں گے۔" انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے تاثرات بدل لیے تھے۔ لہجے میں مٹھاس بھر لی تھی۔

"بابا تو خوش ہوں گے۔۔۔ کیا پتا، زیادہ ہی خوش ہو کر میری اور ماہمن کی منگنی کر دیں۔" عدل نے سنجیدہ گفتگو میں بدلاؤ لانے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔ ایک دم ہی غفیرو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ان کے لبوں پر ماہمن کے ذکر سے مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ ان دونوں کی محبت کو جانتی بھی تھیں۔ پھر بھی وہموں میں پڑ جاتی تھیں۔

"تم نے ٹھیک کہا میرے بیٹے! پر خود سوچو، بابا نے تمہیں کہا نہیں۔ اگر وہ چاہتے تو ضرور تمہیں بھیج دیتے۔ ویسے بھی انہوں نے تمہیں اپنے خاندان سے دور رکھا ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس "وجہ" ضرور ہو گی۔ پھر مورکھ میں تمہارے چچی کی ساس بڑی بدزبان ہے۔ خبطی سی عورت ہے۔ تمہارے بابا کے ساتھ تو جیسے بیر ہے۔ انہیں طعنے کوسنے دیتی ہے۔ وہ لوگ اجڈ، جاہل گنوار ہیں۔ گھر آئے بندے کی عزت کرنا نہیں جانتے۔ اسی لیے تمہارے بابا نے تمہیں ایسے لوگوں سے دور رکھا ہے۔" انہوں نے نرم اور میٹھے انداز میں توجیہہ پیش کی تھی۔ مگر آج عدل کو جانے کیا ہوا تھا۔ وہ ان سے بحث میں پڑ گیا۔

"مجھے چچا کی ساس سے کیا لینا دینا؟ میں تو بابا کی پریشانی کے لیے۔۔۔" عدل نے جھنجلا کر وضاحت کرنا چاہی تھی مگر غفیرو نے اسے ایک دم ٹوک دیا تھا۔

"تمہاری چچی کی ساس۔۔۔ "اس لڑکی" کی نانی ہے۔" انہوں نے دانت پیس کر دل ہی دل میں جوئی کو دو چار گالیاں دی تھیں۔ عجیب جونک لڑکی تھی، جو یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے شوہر اور بیٹے کے حواسوں پہ سوار تھی۔ اگر ادھر آجاتی تو کیا ہوتا؟

"تو مجھے اس بات سے کیا غرض؟ صرف خیریت معلوم کر کے آؤں گا۔ آپ کو پتا تو ہے، بابا اس کے لیے کتنے حساس ہیں۔ انہوں نے مجھے اس لیے نہیں کہا ہو گا کہ میرے امتحانات ہیں۔ وہ مجھے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔" عدل نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا تو گویا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب اسے روکنا آسان نہیں تھا۔ جب بھی وہ کچھ کرنے کی ٹھان لیتا تو تب وہ کر کے ہی دم لیتا۔ وہ جیسے اندر تک لرز گئیں۔

تصور کے پردے پر کسی کی صورت ابھر آئی تھی۔ حسین، دل نشین، دل موہ لینے والی، عمر بھر مقید کر لینے والی۔۔۔ پھر وہ بھی تو اس کی بیٹی تھی۔ گم صم سی ساحرہ، بغیر لڑے، جھگڑے، فساد کیے ہر جنگ جیت جانے والی۔ اگر ان کا بیٹا اس کا اسیر ہو آیا؟ اگر اس عورت کی بیٹی کا جادو چل گیا؟ اگر عدل اس لڑکی کو ساتھ لے آیا؟ تب بھلا کیا ہو گا؟ وہ ہار جائیں گی، ایک مری ہوئی عورت کے سامنے، جو ان کے شوہر کو تو باندھے ہوئے تھی ہی، ان کے بیٹے کو بھی اسیر کر گئی تھی۔ پھر ماہمن کا کیا ہو گا؟ ماہمن اتنی مضبوط نہیں تھی۔ وہ خود کو مار سکتی تھی۔ تباہ کر سکتی تھی، جبکہ غفیرو میں اتنی طاقت نہیں تھی جو وہ ماہمن کی بربادی دیکھ سکتیں۔

فی الوقت انہوں نے دریا دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے عدل کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ متحیر ہوا تھا۔ پھر ایک دم مسکرا دیا تھا۔

"آپ بہت گریٹ ہیں مما! دیکھیے گا، اب میں بابا کو کیا سرپرائز دیتا ہوں۔" وہ ان کے قریب چلا آیا۔ پھر اس نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ان کی پیشانی کو چوما تھا۔

"آپ دنیا کی سب سے اچھی مما ہیں۔" اس نے غفیرو کے ماتھے پہ ایک اور بوسہ دیا تھا۔ وہ جیسے گم صم رہ گئی تھیں۔

"زیادہ دن مت لگانا، میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔" ان کے ہونٹ با آواز ہلے تھے پھر وہ مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تھیں۔ بہت تیزی کے ساتھ ان کا ذہن اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ بھلا وہ کس طرح سے عدل کو روک سکتی تھیں؟ وہ اسے جادوگروں کی بستی میں کبھی نہ جانے دیتیں۔ مورکھ تو ساحروں کا گاؤں تھا۔ وہاں سے جو بھی ہو کر آتا، عمر بھر کے لیے بندھ جاتا۔ تو انہیں کچھ تو کرنا تھا۔ اور عدل کو روکنے کا بھی ان میں حوصلہ نہیں تھا۔ پھر یہ کام ماہمن کے علاوہ کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پہ کھڑی تھیں جب نیچے سے عدل کی آواز آئی۔ وہ سلیم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ غفیرو رک سی گئیں۔

"سلیم! تم گاڑی نکالو، مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ کر آنا ہے اور یاد رہے ماہمن کو پتا نہ چلے۔" وہ تیزی سے سلیم کو ہدایات دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ تو گویا وہ ابھی جا رہا تھا؟ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک زرد، میلا کچیلا کاغذ پھڑپھڑانے لگا تھا۔ تو کیا اسے ہلال نے اس حقیقت کا بتا دیا تھا؟ جو کم از کم غفیرو کے لیے قیامت تھی۔ بہت بھیانک تھی۔

ایک زرد پیلا، خستہ حال، کاغذ اژدھے کی مانند انہیں پھنکار پھنکار کر للکار رہا تھا۔ غفیرو کو لگا جیسے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ بڈھی عورت جیسے عدل کی منتظر کھڑی ہو گی۔ قبر سے نکل کر صدیوں کے پیٹ میں پھنسا راز بتانے کے لیے اور کیا خبر اسی راز کی کھوج، سعی، جستجو، سراغ عدل کو مورکھ لیے جا رہی ہو؟

ان کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔ انہوں نے چکراتے دماغ کے ساتھ ماہمن کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ اس وقت عدل کی دی ہوئی اسائنمنٹ پہ کام کر رہی تھی۔ غفیرو کو حواس باختہ دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی۔ ان کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے۔

"مما! خیریت تو ہے؟" ماہمن ان سے بھی زیادہ گھبرا اٹھی۔ عدل تو ٹھیک ہے؟" عدل کے حوالے سے ان دونوں پھوپھی، بھتیجی کو دھڑکے ہی لگے رہتے تھے۔

"وہ مورکھ جا رہا ہے۔ اسے روک لو۔" ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

ماہمن جیسے سن ہو گئی۔ یہ مما کیا کہہ رہی تھیں عدل کیوں جا رہا تھا پھر اسے بتائے بغیر؟ مورکھ؟ اسی جوئی، کرموئی، رسوئی کے مورکھ؟ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ عدل کی دوری؟ عدل سے دوری؟ اسے کہاں گوارا ہو سکتی تھی۔ چاہے وہ ایک گھنٹے کے لیے ہوتی یا ایک دن کے لیے۔ وہ غفیرو سے تکرار، بحث، تردد، سوال و جواب کے بجائے الٹے قدموں نیچے کی طرف بھاگی۔ تب اسے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس کے پیروں میں جوتے نہیں، اس کے گلے میں دوپٹہ نہیں۔

وہ نیچے آئی تو پورچ کو خالی پایا۔ وہاں عدل کی کار نہیں تھی۔ سلیم بھی نہیں تھا۔ وہ الٹے قدموں اندر کو

دوڑی۔۔۔۔ غفیرو نے اوپر سے کار کی چابی پھینکی۔

"یہ لو عدل بس اسٹاپ پہ ہوگا۔ اسے روک لو۔" وہ نم آواز میں کہہ رہی تھیں۔ مامن نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت غصے اور دکھ سے بے حال تھی۔ آخر عدل اسے بتائے بغیر کیسے جا سکتا ہے۔ وہ اس کی گنوار کزن مامن سے زیادہ اہم تھی۔ عدل اتنی ضروری اسائنمنٹ اس کے سر تھوپ کے خود رشتے داریاں نبھانے چلا گیا۔

وہ غیض کے عالم میں گاڑی بھگا رہی تھی۔ گاڑی سڑک پہ بے ڈول ہونے لگی اور اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ جیسے سب کچھ تہس نہس ہوا اور یہ ہونا ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

مامن کی جذباتیت ہمیشہ اس کے لیے نقصان کا باعث بنتی تھی۔ وہ بنا سوچے سمجھے فیصلے کرتی تھی۔ اس نے زندگی میں بہت سے جذباتی فیصلے کیے تھے۔ چند سال پہلے جب وہ عدل کی محبت میں مخمور اتراتی پھرتی تھی تب اس پہ ایک اور حادثہ اترا تھا۔ غفیرو بھی اس کی سخت ترین انتہائی ردعمل پر تھرا اٹھی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ کالج میں تھی۔ تب عدل 'بابا کے ساتھ کراچی گیا ہوا تھا۔ ان ہی دنوں اس پہ ایک بھیانک انکشاف ہوا تھا۔ اس نے بابا کے سیف میں غیر متوقع ایک زرد پیلا کاغذ نما اژدھا دیکھ لیا تھا۔ اس کی ذات کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اس کے اندر باہر آگ بھڑک اٹھی تھی۔

تب اس کی جذباتیت نے اسے نیند کی گولیاں پھانکنے پہ مجبور کر دیا تھا اور اس کا یہ عمل غفیرو کی جان نکال گیا۔ ان پہ قیامت کا وقت بیت گیا تھا۔ تب غفیرو کی ان تھک محنت 'یقین دہانی' وعدوں اور قسموں نے مامن کو نئی زندگی بخشی تھی۔

وہ اسے سمجھاتی رہیں کہ جو وہ ہے اور کوئی نہیں۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ اسے اپنی پھوپھی پہ بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ اس کی محبت اور دل کو کبھی اُجڑنے نہیں دیں گی۔" اور یہ غفیرو کا یقین 'وعدے اور الفاظ ہی تھے جو مامن 'عدل کے آنے تک پھر سے تندرست ہو گئی۔ پھر وہ عدل سے ہر بات شیئر کرنے والی اس سے کچھ نہ چھپانے والی اتنی بڑی قیامت کی خبر کو چھپا گئی تھی۔

اب ایک مرتبہ پھر اسی جذباتیت کی کرامات سے ہسپتال جا پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

سلیم اسے بس اسٹاپ پہ چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ عدل نے دانستہ موبائل فون آف کر دیا۔ اسے رستوں کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اسی لیے وہ گاڑی پہ جانے کے بجائے بس میں بیٹھ گیا تھا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ جب بس چل پڑی تب وہ مطمئن ہو کر مما کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت حساس تھیں۔ اسے کبھی اکیلے کسی فیملی فرینڈ کے گھر تک جانے نہیں دیتی تھیں۔ ننھیال تو تھا نہیں ددھیال میں بابا اسے کبھی لے کر نہیں گئے تھے۔ اور اب وہ بابا کو بتائے بغیر ان کے گاؤں جا رہا تھا۔ وہ کچھ کچھ ایکسائیٹڈ بھی تھا۔

مما شروع سے ہی عدل اور مامن کے لیے جذباتی تھیں۔ انتہائی حساس 'انہوں اس کے تصور میں مامن کی صورت لہرائی تو اسے ایک تازہ' نرم اور شگفتہ احساس چھو گیا۔

اگر مامن اسے "انتہا" تک چاہتی تھی تو وہ مامن کو "فنا" ہونے تک چاہتا تھا۔ بس اس کی محبت میں مامن جیسی جذباتیت 'بچپنا نہیں تھا اور یہی بات وہ مامن کو سمجھا نہیں پاتا تھا۔ جب وہ بڑے مان سے سوال کرتی۔ "عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" تب اسے مامن پہ ٹوٹ کے پیار آتا۔ وہ اسے کیسے بتا پاتا؟ بھلا محبت کی پیمائش کا کوئی پیمانہ تھا؟

اسے یاد تھا 'بچپن میں بھی مامن کی خواہش کو اولیت دی جاتی تھی۔ مامن اس کے لیے لائی چیزوں کو پسند کرتی۔ اپنی گڑیا چھوڑ کر اس کا بیٹ اٹھا لیتی۔ اپنے باربی ہاؤس سے نہ کھیلتی 'اس کی سائیکل کے لیے مچلتی۔ تب وہ بہت محبت کے ساتھ اپنی چیز اٹھا کر مامن کو دے دیتا تھا۔ مامن کبھی بھی اسے اپنی رقیب نہیں لگی۔ بلکہ مما اور بابا کی محبت جو وہ مامن سے کرتے تھے' عدل کا سیروں خون بڑھاتی تھی۔ مامن کی تعریف اسے اپنی تعریف لگتی۔ وہ بہت لائق اور آؤٹ سٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ بابا اس کو بہت سراہتے تھے اس کی تعریف کرتے اس کی کامیابیوں پر انعامات دیتے۔ بابا نے ان دونوں بہنوں میں اور عدل کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔

مما ان دونوں کو ایک کرنے کے لیے ہلال کبیر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

دراصل ہلال کبیر نے کبھی اتنا لمبا ٹور اور کبھی اتنا لمبا عرصہ گھر والوں سے دور گزارا ہی نہیں تھا۔ جب وہ باہر جا رہے تھے اس سے پہلے ان کی طبیعت خراب تھی۔ پھر بھی وہ مور کھ چلے گئے۔ جب واپس آئے تب زیادہ بیمار تھے۔ کچھ دن ہسپتال بھی رہے۔ پھر اچانک انہوں نے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ غفیرو اور عدل تو چاہتے تھے کہ وہ اپنا پروگرام کینسل کر دیں۔ مگر ہلال کبیر مانے نہیں اور اب پچھلے کئی دن سے ان کا گھر والوں سے رابطہ نہیں تھا۔ غفیرو کو تشویش تھی جبکہ عدل بہت متفکر تھا۔ ان سے آخری دفعہ بات ہوئے بھی کافی دن گزر چکے تھے۔ مما سے تو اس نے ایسے ہی کہہ دیا تھا تاہم وہ خود متوحش تھا کہ بابا نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ ان کے لیے نہ سہی وہ اپنی جوئی کو کسی بھی حال میں بھول نہیں سکتے تھے اور کم از کم جوئی کے لیے ضرور کال کرتے۔

وہ دل ہی دل میں پلاننگ کر رہا تھا۔ بابا کے آنے تک ان کی جوئی کو گھر لانے کی۔ ان سے آخری دفعہ بات ہوئی تب بھی وہ جوئی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے خط نہ ملنے پر پریشان تھے۔ اور اس سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کے وہ الفاظ۔

"عدل! جوئی میرا واحد اٹوٹ خون کا رشتہ ہے جو دنیا میں میرے بھائی کے حوالے سے میرے لیے بچا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔"

انہیں اپنی بھتیجی سے لافانی محبت تھی' وہ بہت آزردہ تھے۔ ان کی آواز بھی بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

عدل کو وہم ہونے لگا تھا کہ بابا یقیناً" ٹھیک نہیں ..... وہ انہیں واپس آنے کے لیے زور دیتا رہا تھا۔ تب وہ اسی بے قرار شکستہ لہجے میں بولے تھے۔

"مجھے آنا تو ہے 'جوئی کے لیے۔ اس کا میرے بغیر کوئی بھی نہیں۔" وہ پھر بھی جوئی کے متعلق بات کر رہے تھے۔ تب لمحہ بھر کے لیے اسے جوئی کا ذکر بہت برا لگا تھا۔ "بابا! آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں۔ میں اتنا مس کر رہا ہوں آپ کو 'کب سے "واپس آجائیں" کی تکرار کر رہا ہوں۔ مگر آپ کی تان جوئی پہ ہی ٹوٹتی ہے۔"

اس کے مصنوعی شکوے کو سن کر وہ بہت وقت سے مسکرائے تھے۔ انہیں بیٹے کے شکوے پہ پیار آیا تھا۔ پھر انہوں نے بہت تحمل کے ساتھ اسے سمجھایا۔

"میرے بیٹے! وہ میری روح ہے میرا سکون ہے میری زندگی ہے۔ وہ صرف میری بھتیجی نہیں میرے وجود کا حصہ ہے۔ میرے ماں جائے کی واحد اولاد ہے۔ اسے دیکھ کر میری غلطیوں کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔ اس سے محبت کر کے میں شانت ہو جاتا ہوں۔"

وہ جیسے اپنی گفتگو کو عدل کے دل پر نقش کر رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے۔ رشتوں کی ایک مالا تھما رہے تھے۔

"اور تم ۔۔۔ میرا بازو ہو ۔۔۔ میرے برابر ۔۔۔ میرے بعد 'میری ہر چیز کے وارث ۔۔۔ میری محبتوں 'چاہتوں' سرمائے' کنبے اور رشتوں کے امین ..... تمہیں میرے کنبے کی حفاظت کرنا ہے میری جان! اور یاد رکھنا۔ جوئی میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔"

بابا کی آواز نم تھی۔ وہ اتنے آزردہ 'رنجیدہ 'غم زدہ کیوں تھے؟ عدل بہت بے چین ہو گیا تھا۔ بہت گھبرا گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا 'وہ کس حال میں ہے؟ مگر میں جانتا ہوں 'وہ بہتر حال میں نہیں۔ کاش کہ میں اس تک پہنچ

پاتا۔ اب تو میری امید بھی ٹوٹ رہی ہے۔" ان کی آواز جیسے ڈوب سی گئی تھی۔

پھر لائن ڈراپ ہو گئی۔ عدل نے بہت کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ بابا کی ان باتوں کو سوچتے ہوئے ان کی فکر کو محسوس کرتے ہوئے اس نے مورکھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یک دم اس کے دل میں عجیب سی بے چینی اٹھ نے لگی تھی، عجیب سا اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ آخر اچانک اسے ہو کیا رہا تھا؟ وہ گھر کی طرف لوٹنا چاہتا تھا مگر یہ چلتی بس اسے کس منزل تک لے آئی تھی؟

ایک دم اس کی سوچوں کو بریک لگ گئے۔

بس اسٹاپ پہ رک گئی تھی۔ یہاں سے مورکھ جانے کے لیے ٹرانسپورٹ دستیاب تھی۔ وہ کسی بھی رکشہ ٹیکسی کو پکڑ سکتا تھا۔ ٹیکسی نے اسے مغلی پل پہ اتار دیا۔ آگے اسے پیدل سفر کرنا تھا۔ وہ پل پہ اتر کر لمحہ بھر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ یہ کیسی جنت نظیر وادی تھی سرسبز و شاداب پہاڑوں سے آراستہ حسین مرغزاروں سے سجی، نیلے پانیوں میں بہتی ہوئی۔ سبزے، پھولوں اور خوشبوؤں سے معطر۔۔۔ ندی کے پار پہاڑوں کی حسین چوٹیاں اور کہر میں ڈوبا زرد پڑتا سورج اور جب سورج افشاندہ ہوتا تب جانے وادی پہ کیسی ابرق سنہری افشاں بکھرتی؟ اس پہ مورکھ کا جادو چڑھنے لگا۔ اسے لگا وہ مشرق کے سوئٹزر لینڈ میں آگیا ہے۔ اسے اب تک یہاں نہ آنے کا افسوس ہوا تھا۔ جانے بابا اسے یہاں کیوں نہیں لائے؟ یہ جگہ تو سیاحت کے لیے بھی آؤٹ کلاس تھی۔ وہ سوچنے لگا، مامن کو شادی کے بعد یہاں ضرور لے کر آئے گا اور مامن کی طرف بہتی سوچیں اسے ایک مرتبہ پھر اس فسوں سے باہر لے آئی تھیں۔ اس کے دل میں پھر سے اضطراب چٹکیاں بھرنے لگا۔

وہ ندی پہ اڑان بھرتے بگلوں کو دیکھنے لگا پھر گہرا سانس کھینچ کر اس پگڈنڈی کی طرف آیا جو آلو بخارے کے باغ میں سے گزرتی تھی۔ وہ ٹنڈ منڈ سے درختوں کے جنگل کو دیکھنے لگا۔ جب یہ سبز پتوں سے مزین اور آراستہ پیراستہ ہوتے ہوں گے کتنے خوب صورت لگتے ہوں گے۔

اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اب وہ رستوں کا تعین کر رہا تھا۔ بس میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ پل سے اتر کر یہی پگڈنڈی بستی میں اترتی ہے۔ وہ اس رستے پہ چلنے لگا۔ معاً" اسے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ کسی درخت کے جھنڈ پیچھے۔۔۔ دو نسوانی آوازیں تھیں۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رک سا گیا۔ اسے کسی سے گھر اور رستے کے بارے میں پوچھ لینا چاہیے۔ وہ اسی لیے ٹھہر گیا تھا۔ اسے کسی کی دکھ، صدمے اور اندیشے میں گھری آواز سنائی دی تھی۔

"بخت گل! اب کیا ہو گا؟" آواز میں آنسو ہی آنسو تھے۔ دکھ ہی دکھ تھا۔

"بس اس عورت نے کہا۔ چاچا صاحب وہاں نہیں رہتے۔ یہ غلط نمبر ہے۔ کہیں اور لگاؤں۔۔۔ اور یہ کہ اس عورت نے تمہارا نام سن کر فون کھٹاک سے بند کر دیا۔" دوسری آواز میں مایوسی تھی۔ جانے وہ دونوں کیا گفتگو کر رہی تھیں؟ بھلا عدل کو ان کی گفتگو سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا۔

"بخت گل! اپنے موبائل سے پھر کال کر دو نا۔ کیا پتا اس عورت کو میرا پتا ہی نہ ہو۔" پہلی آواز پھر سے ابھری تھی۔ کچھ امید اور آس سے بھری۔

"تمہارے سامنے ہی کتنی دفعہ کر چکی ہوں۔ گھنٹی بجتی ہے پر کوئی فون نہیں اٹھاتا۔" دوسری آواز میں اب بھی مایوسی تھی۔ تاہم عدل کچھ چونک گیا تھا۔ موبائل کے ذکر نے اسے چونکا دیا تھا۔ کیا یہاں فون کی سروس اور سہولت موجود تھی؟ اس نے اپنا سیل فون جینز کی جیب سے نکال لیا اسی اثنا میں دو لڑکیاں اپنی جھونک میں چلتی ہوئی سامنے آئیں۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر دونوں ہی حیران رہ گئی تھیں۔ زیادہ گھبرائی لڑکی کچھ پیچھے رہ گئی۔ ذرا پر اعتماد سی تیکوں والی لڑکی آگے آئی۔ عدل نے اسے بغور دیکھا۔ اس کے چہرے بہت سے تل تھے۔ رنگت گوری اور آنکھیں سبز گو چھوٹی تھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ سو خوب صورت

نہیں لگتی تھیں۔ تاہم جو لڑکی کچھ فاصلے پر پتھر کا بت بنی حواس باختہ کھڑی تھی' جیسے کسی نے اسم پھونک کر اسے پتھر کر دیا ہو' اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ یقیناً" وہ حسن و جمال کا پیکر تھی دودھ جیسی یا پھر دودھ میں گھلے گلاب جیسی..... اسے کچھ ٹھیک بیٹھتی تشبیہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ اتنی کمزور لاغر اور دبلی نہ ہوتی تو بہت کمال لگتی۔ وہ اپنی نظر اس روئی روئی' سہمی سہمی لڑکی سے ہٹا کر ایک ہاتھ سے بند ہوا موبائل آن کرتا سامنے کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوا تھا۔

"ڈاکٹر بلال کبیر کے گھر کا پتا ہے؟ آئی مین' ان کے کسی رشتے دار کا گھر!" اس نے بہت شائستگی کے ساتھ پوچھتے ہوئے موبائل کی روشن ہوتی اسکرین کو دیکھا۔

"ہاں..... پتا ہے۔" لڑکی حیران حیران سی اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے گردن موڑ کر دوسری لڑکی کو دیکھ کر کوئی اشارہ بھی کیا تھا۔ عدل وہ اشارہ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ لگاتار میسج کی بجتی ٹیون اسے کسی اور طرف دھیان نہیں دینے دے رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"بتایا نہیں..... تم کون ہو؟ کیا شہر سے آئے ہو؟" وہ دوبارہ بے صبری سے پوچھ رہی تھی۔ عدل اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ کچھ حواس باختہ بے چین' دیوانہ وار میسج دیکھ رہا تھا' موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ایک ایک ٹیکسٹ دیکھ رہا تھا یامن' ڈاکٹر عمیر اور مما کی بے شمار مسڈ کالز اور میسج تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک کھولتا چلا گیا۔

"میرے اللہ! یامن کا ایکسیڈنٹ۔" اس کے پیروں تلے موجود زمین ہل گئی تھی۔ اسے اپنی بے چینی بے قراری اور اضطراب کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ یامن جانے کس اذیت' درد اور تکلیف سے گزر رہی تھی۔ اس کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ کیا اس نے غصے کے عالم میں ایکسیڈنٹ کیا؟ وہ اسے بتائے بغیر جو آ گیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ایسا تعلق' رشتہ' واسطہ تو تھا ہی..... جو وہ اتنی دور..... ہونے کے باوجود یامن کی تکلیف محسوس کر سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا' وہ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرا رہا تو ختم ہو جائے گا۔ اسے واپس جانا تھا۔ یامن سے ملنا تھا' اسے دیکھنا تھا۔ اسے چھونا تھا۔ محسوس کرنا تھا۔ اس کے زندہ ہونے کا یقین کرنا تھا۔ وہ ڈاکٹر عمیر کا میسج دیکھ رہا تھا۔

"جہاں بھی ہو' جلدی آؤ۔ یامن کی حالت تشویش ناک ہے۔" وہ نم آنکھوں سے اسکرین دیکھتا رہا۔ ایک کے بعد ایک میسج کھولتا رہا۔ وہ جیسے پاگل ہوتا رہا۔

"فون کیوں بند ہے تمہارا..... کہاں ہو تم! یامن مر جائے گی تب آؤ گے۔" مما کا میسج تھا۔

"یامن کی حالت نازک ہے۔ عدل! جلدی آؤ۔" یامن کے کئی میسج تھے۔

اس کے چہرے پہ وحشت پھیل رہی تھی..... اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس کے انداز بدل گئے تھے۔ تب ہی سامنے کھڑی لڑکی حیران اور متحیر رہ گئی۔ وہ اس کی اچانک نمکین پانیوں سے بھرتی آنکھوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں؟" وہ پھر سوال لیے کھڑی تھی۔ عدل نے آخری متوحش سی نظر دور کھڑی لڑکی پر ڈالی۔ پھر اڑے اڑے حواسوں کے ساتھ الٹے قدموں بھاگنے لگا تھا۔ بے حواس سا وہ کوئی دیوانہ لگ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پل تک پہنچ گیا۔

"پاگل تھا کوئی۔" بخت گل نے ہاتھ جھاڑ کر تبصرہ کیا۔ "چاچا صاحب کا پوچھ رہا تھا۔ جانے اسے اچانک کیا ہوا۔ میسج دیکھ کے بھاگ گیا۔" بخت گل حیران بھی تھی اور بیزار بھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جوئی کو دیے ہوئے نمبر پہ کال کر رہی تھی مگر اس کا دھیان جوئی کی طرف ہی تھا۔

"ایں..... تو کیا بت بن گئی؟ مانا کہ بابو بڑا خوب صورت تھا پر تجھے کیوں پتھر کر گیا۔" وہ بولتی ہوئی جوئی تک چلی آئی پھر اس نے جوئی کا کندھا ہلایا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ جیسے کوئی بے جان بت ہو۔ بخت گل کچھ پریشان ہوگی' تھوڑا گھبرا گئی۔

"وہ چلا گیا۔" بے جان بت میں جان پڑ گئی تھی۔

اس کی نگاہیں دور پل کے پار اتر گئیں۔ وہ وہاں کھڑا تھا۔ اتنا ہی بے چین' بے حواس اور بے قرار جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی تھی۔

"وہ آیا اس نے فتح کیا اور ساحل پہ کھڑا رہا..... منجدھار تک نہ آیا' مجھے دلدل سے نہ نکالا۔ وہ لوٹ بھی گیا۔ پھر آیا کیوں تھا.....؟" جوئی جیسے پاگل ہونے لگی۔ بخت گل کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

"وہ کوئی مکار' دھوکے باز' چھلیا بھی نہیں تھا۔ پھر نظر کا دھوکا کیوں لگا۔" وہ آلو بخارے کے خزاں رسیدہ باغ سے پوچھنے لگی۔ آتی جاتی سرد ہواؤں سے پوچھنے لگی۔ پتھروں کی اس بستی سے پوچھنے لگی۔ بہتی سرد خاموش ندی سے پوچھنے لگی۔

"کون تھا وہ؟" بخت گل نے متوحش سا ہو کر اسے جھنجھوڑا۔ "بتا نا مجھے وہ کون تھا؟" وہ اس کی بے جان ہوتی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"میرے ڈاکٹر چاچو..... میرے چاچا صاحب کا بیٹا..... عدل کبیر خان۔" اس کے ہونٹ بے آواز پھڑپھڑائے تھے پھر وہ کچھ زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی تو جیسے عمر بھر کی پونجی لٹ گئی تھی۔

"کیا وہ چھوٹا خان تھا؟" بخت گل چکرا کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے گردن موڑ کر پل کی طرف دیکھا۔ پل کے جنگلے کہر میں کھو گئے تھے ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ بخت گل اندھا دھند پل کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ بے حواس سی پل کے کناروں تک پہنچی..... اس نے اپنی آنکھیں مسل مسل کر دیکھا..... وہاں کوئی اجنبی نہیں کھڑا تھا۔ پل کا آخری مسافر آنے والی آخری ویگن میں سوار ہو کر جا چکا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ٹھوکریں کھاتی لوٹ آئی۔

"تیری بے حواسی نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا....." بخت گل اس چھوٹی سی تنہا لڑکی کے ٹوٹے بکھرے وجود کو دیکھتی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ "تجھے قدرت نے ایک لمحہ عنایت کیا تھا۔ چاہتی تو اسے عمر بھر کے لیے باندھ لیتی۔ مگر تیری نادانی نے اسے دھند کے حوالے کر دیا۔"

☆ ☆ ☆

وہ ڈھول ڈھول ہوتا' ہسپتال پہنچا تھا۔ ریسپشن سے ہو کر او۔ٹی کی طرف آیا' وہاں اسے ماربل کے بینچ پہ یامن بیٹھی نظر آئی تھی۔ اس کی بدحال نڈھال ماں جائے نماز پہ بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔ ڈاکٹر عمیر کہیں نہیں تھے۔

"اب بھی نہ آتے..... رشتے داریاں نبھاتے رہتے۔" اس کا لہجہ غم زدہ اور آواز پھٹی پھٹی تھی۔ "کسی روز میری بہن کی جان لے لو گے۔ کسر تو آج بھی نہیں چھوڑی۔" عدل چپ چاپ سنتا رہا' اس کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔

قریب قریب ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر عمیر باہر نکلے تھے۔ وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔ پھر عدل کے بے جان ہوتے شانے پہ بازو پھیلا کر بولے تھے۔

"ہوش میں آنے کے بعد بھی اس نے تمہارا پوچھا۔ محبت نارمل حد تک رہے تو آسانیاں لاتی ہے ورنہ دکھ تکلیف اور پریشانیاں ہی ملتی ہیں۔ یامن سے کہنا' محبت ہو یا نفرت' اعتدال ہی بہترین راستہ ہے۔ یہ جذباتیت اس کے لیے مناسب نہیں۔" وہ اسے اور بھی بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ یامن کے مقابلے میں وہ عدل کے زیادہ قریب تھے۔ پھر وارڈ کی طرف جاتے جاتے قدرے شرارت سے بولے۔

"شادی کے معاملے میں زیادہ دیر مت کرو' ورنہ یامن کی "بے یقینی" اس کا دم ضرور نکال لے گی۔"

ان کا ہلکا پھلکا لہجہ بتا رہا تھا کہ یامن اب خطرے سے باہر ہے۔ اس کا دل جیسے سجدہ ریز ہو گیا۔ اگر یامن کو کچھ ہو جاتا تو وہ خود کو معاف کر سکتا تھا؟ شاید کبھی نہیں۔

یامن کے بعد مما نے بھی طویل کلاس لی تھی کہیں اندر سے یامن کے ساتھ ہونے والے حادثے میں وہ اپنا قصور بھی سمجھتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یامن کس قدر عدل کے لیے جذباتی ہے پھر بھی اس کو آزمانے چلی تھیں۔ اور اب تو وہ یامن کے صحت

مند ہوتے ہی ان دونوں کی شادی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا' ہلال کبیر مانتے یا نہ مانتے۔
ادھر عدل خود احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے اندازہ تو تھا جب وہ مورکھ سے واپس آئے گا تب ماہن بہت ہنگامہ کرے گی اور اگر وہ جوئی کو بھی ساتھ لے آتا تب تو تباہی آجاتی۔ اسے اتنا "بے بس" دیکھ کر عدل کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ عدل نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔
"اب کبھی ایسا مت کرنا۔" بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔
"میں تو بس تمہارے پیچھے جا رہی تھی۔ تم بتائے بغیر جو چلے گئے تھے۔" وہ بہت تھکے تھکے نڈھال لہجے میں بولی تھی۔ بہت معصوم سا انداز تھا۔ عدل کا جی بھر آیا۔
"تم بھی اب ایسا کبھی مت کرنا۔" ماہن بھی جیسے ایک وعدہ لے رہی تھی' ایک عہد میں باندھ رہی تھی۔
"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم اس بستر سے اٹھو ہم امتحان سے پہلے ہی شادی کر رہے ہیں۔"
عدل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔ ماہن پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔
"اور بابا؟" ماہن کی آنکھوں میں ایک خدشہ سا لہرایا۔
"ان کو بھلا کیا اعتراض ہو گا؟ انہیں بھی تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار ہے۔" اس نے جھک کر ماہن کی پیشانی کو چوما تو جیسے اس کے جلتے بلتے دل کو قرار آگیا۔
"یہ بازی' یہ محبت کی بازی وہ ہارتے ہارتے جیت چکی تھی' وہ مورکھ جا کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس کی محبت کی طاقت مورکھ کے فسوں سے زیادہ تھی۔ اس نے اپنی پھوپھی سے سن رکھا تھا' وہ ہلال کبیر خان کی بھتیجی کے حسن سے خوف زدہ تھی ۔عدل کبیر صرف اسی کا تھا' اب کسی یقین کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جوئی' کرموئی' رسوئی محض ایک تحریر میں چھپی رہ گئی تھی بے نام و نشان سی۔ گم شدہ وہ مورکھ کی دھول خاک اور مٹی بن چکی تھی۔
اس کی آنکھوں میں رتن (جواہرات) کی سی چمک تھی۔ وہ —— وہ جیت کے نشے سے مخمور تھی۔ اسے بہت سال پہلے بابا کے سیف میں رکھا پیلا پھٹک کاغذ بھی بھول گیا جسے دیکھ کر وہ ہل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہر گزرتا دن اس کے لیے اذیت کا ایک نیا باب کھول دیتا تھا۔ مگر جب رات آتی تو امنگوں کے دیے جیسے روشن ہو جاتے۔ رات کی کوئی ایک گھڑی بہت نیک' بختاور اور مبارک ثابت ہوتی تھی۔ جو اسے فرحت' شادمانی' خوشی اور سرور کا وہ لمحہ بخش دیتی جب اس نے اپنی زندگی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ جس کی پیشانی پہ روشنی بکھری تھی' جس کا چہرہ اس کے خیالوں سے زیادہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ جو اس کی پوری زیست کا حاصل تھا۔
پہلے پہل وہ لمحہ رات کو کسی وقت اس کی پلکوں پہ دستک دیتا تھا' پھر یہ پوری رات پہ محیط ہو گیا۔ پھر اس سے بھی کچھ آگے بڑھا۔ وہ دن میں بھی سپنے دیکھنے لگی' خمار آلود سا ایک خواب جاگتی آنکھوں کو گلابی کر دیتا تھا۔
وہ کڑاہے میں کڑچھا چلاتے چلاتے کھو جاتی' کہیں گم ہو جاتی' کسی جادو نگری میں پہنچ جاتی۔ اس کے گلاب ہونٹوں پہ مسکان چپکی رہتی۔ اس کے حسین گالوں پہ شفق بکھری رہتی۔ وہ موتی چور کے لڈو بناتے کبھی نہ تھکتی' نہ کسے رات بھر ٹھنڈ لگتی۔ وہ دال پیستی' چھانتی..... اس میں گھی ملاتی' دہی' دودھ کے ڈرم الٹتی۔ بیکنگ پاوڈر کے ڈبے گھولتی خود آٹا آٹا ہو جاتی۔ گھی کڑکڑاتی۔ چھلنی میں بوندیاں ڈال کر گھی میں گراتی' انہیں شیرے میں ڈبوتی' ٹھنڈا ہونے پر

چاندی کے ورق سجا کر لڈو بناتی۔ کبھی بے خیالی میں بوندیاں زیادہ لال پڑ جاتیں' کبھی سیاہ ہو جاتیں' تب گوشی کو غیض چڑھ جاتا تھا۔ وہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گھما گھما کر تھپڑ مارتا۔ اس کے گال پھٹ جاتے' ان میں لہو کی بوندیں پھوٹ پڑتیں اور گوشی کے الفاظ اسے خون خون کر دیتے تھے۔
"حرام زادی! کس کے خیالوں میں رہتی ہے۔ سارا مال خراب کر دیا۔ اسے کون خریدے گا۔" لڈو کبھی زیادہ نرم پڑ جاتے تھے' کبھی لڈو سخت رہ جاتے' گھی کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تو لڈو پتھر کی طرح بجتے۔ کبھی کھویا جل جاتا' کبھی دودھ میں دہی ملا دیتی' کبھی دودھ میں بیسن گھول دیتی۔ سو سو کلو دودھ تباہ ہو جاتا' کھویا پھٹ جاتا۔ بے ذائقہ ہو جاتا' کبھی کڑاہے کے تلوے سے لگ کر سیاہ پڑ جاتا۔ تب ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ گوشی خان گالیاں بکتا' چیختا' چنگھاڑتا۔ اسے مارتا۔
"تیرے ہاتھوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ اب تو کسی قابل نہیں رہی۔ تیرا کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اسے گھورتا' آگ اگلتا باہر نکل جاتا تھا۔ پھر جوئی کی جیسے رسوئی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ گوشی مال تیار کروانے کے لیے کاریگر لے آیا تھا۔ اوپر مرد اور عورتیں' ٹھٹھے لگاتے' قہقہے لگاتے' مذاق کرتے' ہنستے مسکراتے کام میں جتے رہتے۔ مگر سکھ پھر بھی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ عسمی جب بھی اپنے شوہر سمیت یہاں آتی' جوئی کا سکھ چین دھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ عسمی کے لاڈلوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری جوئی کے سر آجاتی تھی۔ وہ ان کی دن رات کے لیے آیا بن جاتی۔ عیش و عشرت میں پلے بڑھے بچے تھے۔ انتہائی نازک مزاج' پیٹو' مغرور' گھمنڈی وہ سارا دن اسے تگنی کا ناچ نچائے رکھتے۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتی' دن بھر ان کی سیوا کرتی۔ رات کو بھی وہ اسی کے پاس سوتے۔ پوری رات کبھی ایک کو لیٹرین جانا ہوتا' کبھی دوسرے کو' کبھی تیسرے کو اور چوتھے' پانچویں کی نیند بدل بدل کر رات بھی گزر جاتی۔ تیسرے نمبر والے کو بستر بھگونے کی عادت تھی۔ ہر گھنٹے بعد اس کا بستر بدلنا پڑتا۔ صبح تک گندے کپڑوں کا ڈھیر لگ چکا ہوتا تھا۔ جنہیں دھو دھو کر اس کی کمر اکڑ جاتی' مگر یہ کام کھویا بنانے کی مشقت اور گوشی خان کی مار سے بہتر ہی تھا۔
وہ اپنے ڈاکٹر چاچو کا انتظار کرتی' دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ اگر انہوں نے عدل کو بھیجا تھا تو یقیناً" وہ خود بھی عنقریب آنے والے تھے۔ وہ اکثر سوچتی' عدل اچانک پلٹ کیوں گیا؟ شاید اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا؟ کوئی ضروری کال یا کوئی حادثہ اسے کھینچ کے واپس لے گیا تھا۔ اس کی خوشی' شادمانی اور دل میں چراغاں ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ عدل اس کے گاؤں تک چلا آیا۔ آخر کوئی نہ کوئی کشش تو اسے کھینچ کے لائی تھی۔ کیا خبر اسے ڈاکٹر چاچو نے بھیجا ہو۔" وہ سوچتی' الجھتی' کبھی ہنس پڑتی' کبھی رو پڑتی.....

☆ ☆ ☆

وہ ایک مرتبہ پھر وقت کے پھیر میں تھی۔ وہ کرخت تند مزاج گونداز خان تھا۔ عسمی کا امیر کبیر شوہر' لاکھوں ایکڑ اراضی کا مالک۔ اس کے کئی بسوں کے اڈے تھے' کئی ٹرک ان اڈوں پہ کرایہ دے کر رکتے۔ کئی ویگن ڈرائیور اس کے تلوے چاٹتے۔ اپنے علاقے میں اس کی خاصی دھاک تھی' عام لوگ اس سے ڈرتے۔ اور رشتے دار اس کی دولت' امارت کی وجہ سے دب کر رہتے تھے۔
بلا کا اوباش فطرت تھا۔ اسے دیکھ کر کشی اور دمی بھی آگے پیچھے ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کشی دمی جیسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی نگاہ ہیروں کی تلاش میں رہتی تھی۔ پھر یہ میلی' کچیلی' گدڑی میں لعل جیسی لڑکی اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ جاتی؟ وہ اگر قیمتی پوشاک پہنتی تو کیسی لگتی؟ اس کے ڈھلے ہوئے سیدھے بال قیامت ڈھاتے' اس کی رنگت' آنکھیں شکل و صورت —— سب کمال کا تھا۔ بس اسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔
وہ نگر نگر' شہر شہر گھوما ہوا تھا۔ ہر رنگ اور ہر فیشن

مند ہوتے ہی ان دونوں کی شادی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا' ہلال کبیر مانتے یا نہ مانتے۔

ادھر عدل خود احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے اندازہ تو تھا جب وہ مورکھ سے واپس آئے گا تب مامن بہت ہنگامہ کرے گی اور اگر وہ جوئی کو بھی ساتھ لے آتا تب تو تباہی آجاتی۔ اسے اتنا "بے بس" دیکھ کر عدل کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ عدل نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔

"اب کبھی ایسا مت کرنا۔" بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"میں تو بس تمہارے پیچھے جا رہی تھی۔ تم بتائے بغیر جو چلے گئے تھے۔" وہ بہت تھکے تھکے نڈھال لہجے میں بولی تھی۔ بہت معصوم سا انداز تھا۔ عدل کا جی بھر آیا۔

"تم بھی اب ایسا کبھی مت کرنا۔" مامن بھی جیسے ایک وعدہ لے رہی تھی' ایک عہد میں باندھ رہی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم اس بستر سے اٹھو ہم امتحان سے پہلے ہی شادی کر رہے ہیں۔"

عدل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔ مامن پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اور بابا؟" مامن کی آنکھوں میں ایک خدشہ سا لہرایا۔

"ان کو بھلا کیا اعتراض ہو گا؟ انہیں بھی تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار ہے۔" اس نے جھک کر مامن کی پیشانی کو چوما تو جیسے اس کے جلتے بلتے دل کو قرار آگیا۔

"یہ بازی' یہ محبت کی بازی وہ ہارتے ہارتے جیت چکی تھی' وہ مورکھ جا کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس کی محبت کی طاقت مورکھ کے فسوں سے زیادہ تھی۔ اس نے اپنی پھوپھی سے سن رکھا تھا' وہ ہلال کبیر خان کی بھتیجی کے حسن سے خوف زدہ تھی۔ عدل کبیر صرف اسی کا تھا' اب کسی یقین کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جوئی' کرموئی' رسوئی محض ایک تحریر میں چھپی رہ گئی تھی بے نام و نشان سی۔ گم شدہ وہ مورکھ کی دھول خاک اور مٹی بن چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں رتن (جواہرات) کی سی چمک تھی۔ وہ —— وہ جیت کے نشے سے مخمور تھی۔ اسے بہت سال پہلے بابا کے سیف میں رکھا پیلا پھٹک کاغذ بھی بھول گیا جسے دیکھ کر وہ ہل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہر گزرتا دن اس کے لیے اذیت کا ایک نیا باب کھول دیتا تھا۔ مگر جب رات آتی تو امنگوں کے دیے جیسے روشن ہو جاتے۔ رات کی کوئی ایک گھڑی بہت نیک' بختاور اور مبارک ثابت ہوتی تھی۔ جو اسے فرحت' شادمانی' خوشی اور سرور کا وہ لمحہ بخش دیتی جب اس نے اپنی زندگی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ جس کی پیشانی پہ روشنی بکھری تھی' جس کا چہرہ اس کے خیالوں سے زیادہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ جو اس کی پوری زیست کا حاصل تھا۔

پہلے پہل وہ لمحہ رات کو کسی وقت اس کی پلکوں پہ دستک دیتا تھا' پھر یہ پوری رات پہ محیط ہو گیا۔ پھر اس سے بھی کچھ آگے بڑھا۔ وہ دن میں بھی سپنے دیکھنے لگی' خمار آلود سا ایک خواب جاگتی آنکھوں کو گلابی کر دیتا تھا۔

وہ کڑاہے میں کڑچھا چلاتے چلاتے کھو جاتی' کہیں گم ہو جاتی' کسی جادو نگری میں پہنچ جاتی۔ اس کے گلاب ہونٹوں پہ مسکان چپکی رہتی۔ اس کے حسین گالوں پہ شفق بکھری رہتی۔ وہ موتی چور کے لڈو بناتے کبھی نہ تھکتی' نہ اسے رات بھر ٹھنڈ لگتی۔ وہ دال پیستی' چھانتی —— اس میں گھی ملاتی' دہی' دودھ کے ڈرم الٹتی۔ بیکنگ پاوڈر کے ڈبے گھولتی خود آٹا آٹا ہو جاتی۔ گھی کڑکڑاتی۔ چھلنی میں بوندیاں ڈال کر گھی میں گراتی' انہیں شیرے میں ڈبوتی' ٹھنڈا ہونے پر چاندی کے ورق سجا کر لڈو بناتی۔ کبھی بے خیالی میں بوندیاں زیادہ لال پڑ جاتیں' کبھی سیاہ ہو جاتیں' تب گوشی کو غیض چڑھ جاتا تھا۔ وہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گھما گھما کر تھپڑ مارتا۔ اس کے گال پھٹ جاتے' ان میں لہو کی بوندیں پھوٹ پڑتیں اور گوشی کے الفاظ اسے خون خون کر دیتے تھے۔

"حرام زادی! کس کے خیالوں میں رہتی ہے۔ سارا مال خراب کر دیا۔ اسے کون خریدے گا۔" لڈو کبھی زیادہ نرم پڑ جاتے تھے' کبھی لڈو سخت رہ جاتے' گھی کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تو لڈو پتھر کی طرح بنتے۔ کبھی کھویا جل جاتا' کبھی دودھ میں دہی ملا دیتی' کبھی دودھ میں بیسن گھول دیتی۔ سو سو کلو دودھ تباہ ہو جاتا' کھویا پھٹ جاتا۔ بے ذائقہ ہو جاتا' کبھی کڑاہے کے تلوے سے لگ کر سیاہ پڑ جاتا۔ تب ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ گوشی خان گالیاں بکتا' چیختا' چنگھاڑتا۔ اسے مارتا۔

"تیرے ہاتھوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ اب تو کسی قابل نہیں رہی۔ تیرا کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اسے گھورتا' آگ اگلتا باہر نکل جاتا تھا۔ پھر جوئی کی جیسے رسوئی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ گوشی مال تیار کروانے کے لیے کاریگر لے آیا تھا۔ اوپر مرد اور عورتیں' ٹھٹھے لگاتے' قہقہے لگاتے' مذاق کرتے' ہنستے مسکراتے کام میں جتے رہتے۔ مگر سکھ پھر بھی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ عسمی جب بھی اپنے شوہر سمیت یہاں آتی' جوئی کا سکھ چین دھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ عسمی کے لاڈلوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری جوئی کے سر آجاتی تھی۔ وہ ان کی دن رات کے لیے آیا بن جاتی۔ عیش و عشرت میں پلے بڑھے بچے تھے۔ انتہائی نازک مزاج' پیٹو' مغرور' گھمنڈی وہ سارا دن اسے تگنی کا ناچ نچائے رکھتے۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتی' دن بھر ان کی سیوا کرتی۔ رات کو بھی وہ اسی کے پاس سوتے۔ پوری رات کبھی ایک کو لیٹرین جانا ہوتا' کبھی دوسرے کو' کبھی تیسرے کو اور چوتھے' پانچویں کی نمبر بدل بدل کر رات بھی گزر جاتی۔ تیسرے نمبر والے کو بستر بھگونے کی عادت تھی۔ ہر گھنٹے بعد اس کا بستر بدلنا پڑتا۔ صبح تک گندے کپڑوں کا ڈھیر لگ چکا ہوتا تھا۔ جنہیں دھو دھو کر اس کی کمر اکڑ جاتی' مگر یہ کام کھویا بنانے کی مشقت اور گوشی خان کی مار سے بہتر ہی تھا۔

وہ اپنے ڈاکٹر چاچو کا انتظار کرتی' دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ اگر انہوں نے عدل کو بھیجا تھا تو یقیناً" وہ خود بھی عنقریب آنے والے تھے۔ وہ اکثر سوچتی' عدل اچانک پلٹ کیوں گیا؟ شاید اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا؟ کوئی ضروری کال یا کوئی حادثہ اسے کھینچ کے واپس لے گیا تھا۔ اس کی خوشی' شادمانی اور دل میں چراغاں ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ عدل اس کے گاؤں تک چلا آیا۔ آخر کوئی نہ کوئی کشش تو اسے کھینچ کے لائی تھی۔ کیا خبر اسے ڈاکٹر چاچو نے بھیجا ہو۔" وہ سوچتی' الجھتی' کبھی ہنس پڑتی' کبھی رو پڑتی ——

☼ ☼ ☼

وہ ایک مرتبہ پھر وقت کے پھیر میں تھی۔ وہ کرخت تند مزاج گونداز خان تھا۔ عسمی کا امیر کبیر شوہر' لاکھوں ایکڑ اراضی کا مالک۔ اس کے کئی بسوں کے اڈے تھے' کئی ٹرک ان اڈوں پہ کرایہ دے کر رکتے۔ کئی ویگن ڈرائیور اس کے تلوے چاٹتے۔ اپنے علاقے میں اس کی خاصی دھاک تھی' عام لوگ اس سے ڈرتے۔ اور رشتے دار اس کی دولت' امارت کی وجہ سے دب کر رہتے تھے۔

بلا کا اوباش فطرت تھا۔ اسے دیکھ کر کشی اور دمی بھی آگے پیچھے ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کشی دمی جیسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی نگاہ ہیروں کی تلاش میں رہتی تھی۔ پھر یہ میلی' کچیلی' گدڑی میں لعل جیسی لڑکی اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ جاتی؟ وہ اگر قیمتی پوشاک پہنتی تو کیسی لگتی؟ اس کے دھلے ہوئے سیدھے بال قیامت ڈھاتے' اس کی رنگت' آنکھیں شکل و صورت —— سب کمال کا تھا۔ بس اسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

وہ نگر نگر' شہر شہر گھوما ہوا تھا۔ ہر رنگ اور ہر فیشن

سے واقف تھا۔ اس کے زرخیز ذہن نے جوئی کے لیے لمحوں میں بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ اسے ڈری، سہمی، معصوم سی کنجشک (چڑیا) کو اپنے دام میں کرنا تھا اور یہ کام اس کے لیے ناممکن ہرگز نہیں تھا۔

گوندازخان نے اپنے اکلوتے سالے کو قابو میں کر لیا۔ اسے بڑا میٹھا دانہ پھینک کر بلا لیا۔ وہ دانہ چگتا ہوا اس کے جال میں آگیا۔ بات چونکہ اس کے بھلے کی تھی سو اس کے دل کو ٹھک سے جا لگی۔ تھا وہ بھی بلا کا شاطر۔ سو حساب پورا کر کے معاملے کو آگے لے کر چلا تھا۔

پھر جو گوشی خان کے دبنگ فیصلے نے گھر میں بھونچال مچایا۔ ایک قیامت کا منظر نظر آیا۔ پہلی مرتبہ ماں نے سینہ کوبی کی اور عسمی چھلہ بھلا کر بپھری ہوئی شیرنی بنی دھاڑتی نظر آئی۔ گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ بچے سہم گئے اور چپک چپک کر جوئی کے پہلو میں لگتے۔ اور جوئی ایسی متوحش کہ بچوں کی اوٹ میں خود کو چھپانے لگتی۔ تب یہ منظر دیکھ کر ماں اور عسمی خوں خوار درندے کی مانند اس پہ جھپٹ پڑتیں۔

پچھلے کئی دن سے وہ عسمی اور ماں کی مار کھا رہی تھی۔ کبھی ڈنڈوں سے، کبھی سوٹوں سے، کبھی جوتوں سے وہ اسے مار مار کے خود بھی بے حال ہو جاتیں۔ سینہ پیٹتیں، بین کرتیں۔ اسے گالیاں کوسنے دیتیں۔ بد دعائیں دیتیں ۔۔۔ سر میں دھول اڑاتیں۔ کسی پل دونوں سکون نہیں پا رہی تھیں۔ گوشی اور گوندازخان کے سامنے ان کی زبان تک نہ ہلتی تھی۔ بس جوئی پہ چلتا تھا۔

"اے ۔۔۔ تجھے میرے شوہر پہ ڈورے ڈالتے شرم نہ آئی۔ تیرے باپ کی عمر کا ہے حرام زادی۔ کیا اسی دن کے لیے تجھے اناج کھلا رہے تھے؟" مردوں کی غیر موجودگی میں عسمی ماتم کرتی، اسے لہولہان کر دیتی تھی۔ اسے سارا قصور جوئی کا نظر آتا۔ وہ نہ خوب صورت ہوتی، نہ اس کی شکل اچھی ہوتی اور نہ گوندازخان کی نگاہ میں ٹھہرتی۔

ماں اور عسمی اس کی ماں اور نانی تک کو نہیں بخشتی تھیں۔ تاہم مردوں کے سامنے دونوں کی زبان تالو سے چپک جاتی۔ عسمی کو جیسے سانپ سونگھ جاتا تھا۔ شوہر کے دبدبے کی وجہ سے وہ زبان نہیں ہلا پاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسی کشمکش میں نکاح کا دن آگیا تھا۔ گوشی خان کے ان دنوں رنگ انوکھے تھے۔ وہ بڑا مسرور اور شاد نظر آتا تھا۔ بھاگ بھاگ کے نکاح کی تیاریاں کروا رہا تھا۔ انتظامات دیکھ رہا تھا۔ جوئی کے لیے پہلی مرتبہ قیمتی ملبوسات آ رہے تھے اور وہ انہیں ایسی خوف زدہ نظروں سے دیکھتی جیسے وہ سانپ تھے جو اسے ڈس لینے والے تھے۔

نکاح سے ایک دن پہلے ماں، عسمی کی تشویش ناک حالت کی وجہ سے گوشی خان کے لتے لینے لگی تھی۔

"تجھے حیا نہ آئی۔ اپنی منگ کا نکاح بہن کے شوہر سے کروا رہا ہے۔ تیری عقل کہاں گئی؟ بہن کی حالت بھی نظر نہیں آئی؟ وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی ہے۔" ماں زخمی شیرنی کی طرح دہاڑ رہی تھی جبکہ گوشی کا اطمینان قابل دید تھا۔ اس نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"رہنے دو اماں! جھوٹ ~~بیلہ~~ وہ میری منگ نہیں۔" مسکرایا تھا۔ "رہی عسمی، تو اسے سمجھا دو۔ سالوں بعد اس کا شوہر کوئی فائدہ دے رہا ہے۔ ایک دفعہ فائدہ حاصل کر لوں، جس طرح نکاح کروا رہا ہوں۔ اسی طرح طلاق بھی دلوا دوں گا۔ ویسے بھی اس کا شوہر ڈال ڈال منڈلانے والا ہے ۔۔۔ اسے کھول پر نہ لے۔" گوشی کی مسکراہٹوں کا کوئی انت نہیں تھا۔ ماں کے دل کو تسلی ہو گئی۔ لگ رہا تھا گوشی کوئی لمبا ہاتھ مارنے والا ہے۔ سو خود تو مطمئن ہو گئی تھی مگر عسمی کو اطمینان نہ دلا سکی۔ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ دو ٹکے کی چمرخ سی لڑکی، جسے ملازمہ جتنی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وہ اس کی سوکن کا رتبہ پانے والی

تھی۔ اب وہ بے دم ہو چکی تھی۔ گوندازخان نے ایک ہی جھٹکے میں طلاق کی دھمکی دے کر اس کے سارے بل نکال دیے تھے۔ وہ اس کم ذات لڑکی کے لیے اتنا ہی باؤلا ہو رہا تھا جو پانچ بیٹے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ورنہ ان ہی بیٹوں کی ماں ہونے پر وہ اتراتی پھرتی تھی۔ نکاح کی سویرے تو عسمی بالکل ہی خاموش ہو چکی تھی۔ ماں کو اسے چپ دیکھ دیکھ کر ہول اٹھتے تھے۔

جوئی چوبارے پہ بیٹھی چپکے چپکے انہیں دیکھتی اور پھر سہمی نظروں کے ساتھ زرق برق ملبوسات پہ نگاہ ڈالتی۔ اس کا پورا وجود رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپا رہا تھا وہ کمزور لڑکی تھی ۔۔۔ بے سہارا تھی ۔۔۔ بے آسرا تھی تب ہی ایک سچ اگلنے کی جرات نہیں کر پائی تھی۔ کیونکہ نانی اور ڈاکٹر چاچو نے منع کر رکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا جب وہ اسے لینے آئیں گے تب سب کو بتا کر جائیں گے۔ وہ ان کے آنے سے پہلے کسی کو کچھ نہ بتائے۔ اور جوئی ایسی فرماں بردار تھی کہ ان کی نصیحت کو پلو سے باندھ گئی۔ اس کڑے وقت میں بھی کچھ بول نہ سکی۔

وہ ایسے ہی سر نیہوڑائے بیٹھی اپنے دکھوں اور زخموں کو دھو رہی تھی جب پڑوس والے چوبارے سے کسی کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر بائیں طرف دیکھا۔ وہاں گرم خان کھڑا تھا۔ ہاتھ میں موبائل پکڑے۔ اسے اشارے سے بلا رہا تھا۔ وہ کچھ اور خوف زدہ ہو گئی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو ۔۔۔؟

وہ تھر تھر کانپتی گرم خان کو دیکھتی رہی۔ جو اس کا تذبذب اور خوف محسوس کر کے چھلانگ لگا کر چوبارے والی چھت پہ کود پڑا تھا۔ جوئی کا دل جیسے حلق میں آگیا۔

"لالئی! ڈرو نہیں ۔۔۔ میں یہ موبائل لایا ہوں ۔۔۔ چاچا صاحب کا فون آ رہا ہے ۔۔۔ ہر روز آتا ہے۔ پر اماں تمہاری ماں کے خوف سے بتاتی نہیں۔ تمہاری ماں نے منع کر رکھا ہے۔ چاچا صاحب کی کال تمہیں نہیں سنوانی۔ یہ لو ۔۔۔ بات کر لو۔" گرم خان نے جیسے اسے کوئی مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔ وہ موبائل کو بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

جب نانی زندہ تھیں، تب اسی نمبر پہ ڈاکٹر چاچو کی کال آیا کرتی تھی۔ اس وقت پڑوسن کو ماں کا خوف نہیں تھا۔ تب وہ موبائل بھیج دیتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں تھا۔ ماں کی بدزبانی کے خوف سے کوئی بھی ادھر نہیں آتا تھا۔

جوئی اس ننھے سے مشینی پرزے کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ ابھی اس کے چاچو صاحب کی آواز آنے والی تھی۔ وہ لحہ لحہ گننے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اسکرین چمک اٹھی۔ کوئی باہر کا نمبر تھا۔ جوئی نے بے تابی سے موبائل کان سے لگا لیا۔

"ڈاکٹر چاچو! آپ کہاں چلے گئے۔" اس کے علاوہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔

اس کے الفاظ آنسوؤں نے نگل لیے تھے۔ وہ اپنے دکھ درد، تکلیف، مار، اذیتیں کچھ بھی نہ بتا سکی تھی۔ وہ انہیں یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ نانی اسے اتنے گرگ کہن (پرانے، مکار، بھیڑیوں) کے جنگل میں تنہا چھوڑ گئیں۔ کیسے مکروہ لوگ اسے قیدی بنا رہے ہیں۔ اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال رہے ہیں۔

چاچو کی آواز سن کر اس کے پورے وجود میں تھرتھری، کپکپی اور لرزہ طاری تھا۔ جبکہ دوسری طرف چاچو اس سے مخاطب تھے جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔ جانے لائن میں خرابی تھی یا پھر وہ اتنی نحیف اور کمزور آواز میں بول رہے تھے، وہ اپنی بدحواسی میں کچھ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

"جوئی! میری بیٹی، میری جان! بہت تھوڑا وقت ہے میرے پاس۔ دھیان سے سن لو میری بات۔ میں ملک سے باہر ہوں۔ میں کسی کانفرنس میں شرکت کرنے نہیں آیا تھا۔ یہاں میں نے دل کی چیر پھاڑ کروائی ہے۔ کسی کو بتایا نہیں ۔۔۔ غفیو پریشان ہوتی اور عدل اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ادھوری چھوڑ کر میرے پاس آجاتا ۔۔۔ اس لیے سب کو لاعلم ہی رکھا۔ تمہیں بھی نہیں بتایا۔ میری پیاری بیٹی! میں بہت مضمحل ہوں۔ تھکان سے چور ہوں، بہت شل ہیں

میرے اعصاب ' میں مایوس اور نا امید بھی ہوں۔ جانے تمہیں دیکھ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ پتا نہیں یہ میری آخری کال ہو ـــــ میری بیٹی ! تم اچھے حالوں میں نہیں۔ میرا بس چلے تو اڑ کر تمہارے پاس آجاؤں اور تمہیں چاچی کی خواہش کے مطابق دھوم دھام سے اپنے گھر لے جاؤں۔ کاش کہ مجھے تھوڑی اور مہلت مل جاتی۔ ڈاکٹر مایوس نہ بھی ہوں ' میں اپنی کیفیات سمجھتا ہوں۔ تم سے بات کرنے کے بعد عدل کو کال کرنے لگا ہوں۔ مجھے اس بچے نے چاچی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم وہاں اب کن حالوں میں ہو تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں۔ میں عدل کو بھیج رہا ہوں ـــــ وہ تمہیں وہاں سے لے آئے گا ـــــ میری جان ! یاد رکھنا ' میرا بیٹا ' رشتے اور محبتیں نبھانے والا ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا اور احتیاطاً "گھر کا پتا بھی لکھ لو۔ زیادہ بول نہیں پاؤں گا۔ میری سانس اٹک رہی ہے ـــــ سن رہی ہو نا جوئی ! میں ٹھیک نہیں ہوں۔"

ان کی آواز میں ٹوٹے کانچ کی جھنکار تھی۔ وہ اپنی آواز سے بڑھ کر بیمار تھے۔ ان سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا اور یہی کیفیات جوئی کی تھیں۔ نہ وہ اپنی بے تابیاں بتا سکی نہ ان کے لیے اپنی محبت کا اظہار کر سکی۔ اسے دراصل "اظہار" کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔

"جوئی ! عدل آجائے گا۔" وہ اس کے اندر روح پھونک رہے تھے۔ اسے زندگی بخش رہے تھے اور خود نجانے کن خاموشیوں کی اتھاہ میں گرتے جا رہے تھے۔ تب جوئی کو ہونٹ سیے دیکھ کر گرم خان نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ پھر اسے ڈپٹ کر بے ساختہ چیخا۔

"لالئی ! چاچا صاحب کو بتاؤ ' یہاں درندے تمہارا کیا حشر کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں مارتے ہیں ' اذیت دیتے ہیں اور آج تمہارا نکاح ہے۔ بتاؤ چاچا صاحب کو۔"

گرم خان کی گرم ' پھنکارتی آواز لہروں کے دوش پہ بستر مرگ پر پڑے اس بہت پیارے شخص کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ ان کا دوسرے ہاتھ میں پکڑا موبائل ' عدل کا نمبر ملاتی انگلیاں جیسے لمحوں میں بے جان ہو گئی تھیں۔ دونوں موبائل ان کے ہاتھوں سے گر پڑے تھے۔

"نکاح ؟ نہیں ـــــ نہیں ' ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ زیر لب بڑبڑائے تھے ' پھر جیسے دھڑام کی آواز کے ساتھ لڑھک گئے۔ موبائل سے آواز آنا بند ہو گئی تھی اور ادھر جوئی کے پتھر وجود میں بھی جان پڑ گئی۔ وہ روتے روتے زمین پر ڈھے گئی۔ اس کے نیلے ہونٹ کپکپا رہے تھے ' اس کا کمزور وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔

"ڈاکٹر چاچو ! مجھ سے دور چلے گئے ڈاکٹر چاچو ! مجھے تنہا چھوڑ گئے ڈاکٹر چاچو جوئی تباہ ہو گئی فنا ہو گئی۔"

اب کون تھا جو ڈاکٹر چاچو کے سیف میں محفوظ راز کو کھول کر عدل تک پہنچاتا ؟ وہ راز جس کے بارے میں صرف غفیرو جانتی تھیں یا پھر ماں۔ جس نے بہت سال پہلے اس زرد کاغذ کو دیکھ کر نیند کی گولیاں پھانک لی تھیں ' پھر غفیرو کے یقین اور اس کاغذ کی معمولی سی اہمیت بھی نہ دیکھ کر وہ پھر سے جینے لگی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی سیف میں رکھا کاغذ کبھی بھی عدل تک پہنچ نہیں پائے گا۔ اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆
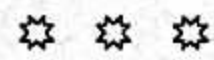
اس کے ہاتھ سے آخری آس کا دیا بھی گر گیا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ ڈاکٹر چاچو کی آواز اب دوبارہ سنائی نہ دے گی۔ وہ پیارا انسان ' وہ چاہتیں لٹانے والا شخص کبھی اس کی آنکھیں دیکھ نہ پائیں گی۔

دل جو ڈاکٹر چاچو کے انتظار میں لہولہو ہو رہا تھا اب خوف سے دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنی بدبختی کا یقین ہو چکا تھا۔

اس کے آس پاس ناانصاف ' ظالم ' خبیث اور ستمگر لوگ تھے۔ اور جوئی تو خود ارنڈ جیسے پیڑ کی طرح تھی ' جس کے پتے تو تھے لیکن جڑ نہایت کمزور تھی اور جن پودوں کی جڑیں کمزور ہوں ' وہ کب طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے تو "دعائے خیر" کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

معا" کوئی دبے قدموں اوپر آیا تھا۔ جوئی کا ننھا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ایکدم سہم کر اٹھ گئی۔ اوپر آنے والی عسمی تھی ' خونخوار تیور لیے سوجی آنکھیں بکھرے بال اور تھل تھل کرتا سراپا لیے۔ اس کے ہاتھ میں جوئی کی سب سے قیمتی متاع یعنی وہ صندوقچہ تھا۔ جس میں ایک سالوں پرانا راز پوشیدہ تھا۔ جوئی کا دل جیسے حلق میں آگیا۔ عسمی نے وہ صندوقچہ اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ پھر ایک سیاہ چادر بھی اس کی طرف پھینکی اور اس کا بازو دبوچ کر رسوئی تک لے آئی۔

"یہاں ـــــ سے بھاگ جا ' یہ تیرے لیے سولی چڑھنے سے بہتر ہے۔ اگر گونداز خان سے بچ بھی گئی تو گوشی سے نہیں بچے گی۔ میرا گھر تو ٹوٹے گا ہی ـــــ پر تو بھی برباد ہو جائے گی۔ یہ پکڑ کرایہ اور اپنے چچا کے پاس پنڈی چلی جا۔" وہ خونخوار عسمی ' مہربان فرشتہ بنی اسے راہ دکھا رہی تھی۔ اپنا گھر بچانے کے لیے ہی سہی

"میں نے پچھلی طرف لکڑی کی سیڑھی لگائی ہے۔ تو چھت سے اتر کر پچھلی طرف سے بھاگ جا۔" عسمی اسے رسوئی کی پچھلی کھڑکی تک کھینچ لائی تھی۔ تب جوئی کے کمزور پڑتے وجود میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے صندوقچہ کھول کر اندر سے وہ خستہ حال لفافہ نکالا۔ لفافے کے اندر پیلا پڑتا ' کاغذ موجود تھا اور ایک تصویر بھی محفوظ رکھی تھی۔ جوئی کی جان میں جان آئی۔ اس نے صندوقچے سے ہاتھ برابر کپڑے کی تھیلی نکالی۔ اسے بازو کے ساتھ باندھا اور آستین نیچے کرلی۔ چونکہ عسمی اکیلی اسے بھگانے کے منصوبے میں شامل نہیں تھی۔ بلکہ دمی ' بخشی اور ماہی بھی شریک تھیں۔ عام حالات ہوتے تو ماہی مفت کی نوکرانی کو کبھی عمر بھر ہاتھ نہ جانے دیتی۔ مگر اب معاملہ کچھ اور تھا۔ لاڈلی بیٹی کو تباہی سے بچانے کے لیے واحد حل یہی تھا کہ جوئی کو یہاں سے بھگا دیا جاتا۔ اور جوئی تھی کہ اس عظیم مہربانی اور رحم پر ان کے تمام پچھلے گناہ بھی معاف کرنے کو تیار تھی۔ جوئی کھڑکی سے کودنے لگی تب عسمی نے لحہ بھر کے لیے اسے روک لیا۔

"تیرے پاس وقت بہت کم ہے ـــــ احتیاط سے منہ چھپا کر نکلنا۔ اور ہاں ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔ ہم سب اپنے اپنے گناہ کی پکڑ میں آچکے ہیں۔ اماں نے اور ہم نے تیرے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ جا اللہ کی امان میں ـــــ"

عسمی کی بھرائی آواز جوئی کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے گردن موڑ کر آخری مرتبہ عسمی کی طرف دیکھا تھا۔ اور گویا اس کا کلیجہ حلق میں آگیا۔ عسمی کے پہاڑ جیسے وجود کے پیچھے گوشی خان کھڑا تھا۔ جوئی کا خوف و ہراس کا مارا دل کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ اور کچھ یہی حال عسمی کا بھی تھا۔ وہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی۔ گوشی خان کے تیور ہی کچھ ایسے تھے۔

"نیچے ملا کے آنے کا وقت ہو چکا ہے اور تو اسے گھر سے بھگا رہی ہے۔ جاتے جاتے اپنے گناہ بھی بخشوا رہی ہے۔ تیرا تو کچھ مزہ چکھاتا ہوں پہلے اس بھگوڑی سے نپٹ لوں۔"

گوشی خان عسمی کو گھسیٹ کر رسوئی سے باہر لے گیا تھا۔ پھر بڑا دروازہ بند کر کے تھر تھر کانپتی جوئی تک آیا۔ رسوئی میں دروازہ بند ہونے کی وجہ سے ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا ایک ہیبت ناک منظر ' دل دہلا دینے والا نظارہ ـــــ سامنے کھڑا مرد اس کا ماموں زاد بھائی نہیں کوئی درندہ لگ رہا تھا۔ کوئی خوفناک بھیڑیا دکھ رہا تھا۔

"حرام زادی ! کس کے پاس بھاگ کر جا رہی تھی ؟ تیرا چاچا مر گیا ' شہر سے اطلاع آئی ہے۔ اب تیرا جانا بیکار ہے۔ وہاں تجھے کس نے منہ لگانا ہے۔ ادھر تجھے عزت سے بیاہ رہا تھا پر تجھے عزت راس نہیں آئی۔"

"شہر سے اطلاع آئی ہے "تیرا چاچا مر گیا ہے" جوئی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ منہ کے بل گری اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا۔ تب اس کے گرد ایک ہجوم تھا۔ سینہ پیٹتی ماہی ' بخشی ' دمی اور گم صم کھڑی عسمی جو اتنی بے بس تھی کہ نہ بھائی کو روک سکتی تھی۔ نہ شوہر

کو۔۔۔ پانچ لڑکوں کو پیدا کر کے بھی دو کوڑی کی تھی۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی، تب ماہی ماتھا پیٹتی چیخی۔

"رونے کے سوا تیرا اور کام ہی کیا ہے؟ مان جا تو بڑی بدنصیب ہے۔ بھاگ بھی نہیں سکی۔"

ماہی بہت بجھی بجھی تھی۔ جیسے سارے بل نکل گئے تھے۔ بیٹی کی راجدھانی پہ قبضہ ہونے والا تھا۔ وہ بھی اس کے اپنے بیٹے کی سازشوں اور منصوبوں کی دولت۔ ماہی کا بس چلتا جوئی کو اسم پڑھ کر غائب کر دیتی۔ مگر بس ہی تو چلتا نہیں تھا۔ نہ بیٹے کے سامنے جرات تھی نہ داماد کے سامنے۔ دونوں ہی لالچی اوباش تھے۔

پاس ہی زرق برق لباس پڑا تھا۔ زیورات کے ڈبے، لشکارے مارتا سامان۔۔۔ چمکیلا، ملائم، نفیس لباس۔۔۔ نیا نکور، عمر بھر جس جوئی کو نیا کپڑا نصیب نہیں ہوا تھا اس کے لیے ملبوسات کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ وہ سب زخمی نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

"موئے نے طلاق کی دھمکی دی ہے۔ اب عسمی بولی تو بچوں کی بھی پروا نہیں کرے گا۔ دھن، دولت کا مان ہے اسے۔" ماہی اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ یہ بھی وقت جوئی پہ آنا تھا جب ماہی اپنے دکھڑے جوئی کو سناتی۔ قدرت کا انصاف شاید اسی کو کہتے ہیں۔۔۔ کل تک جو سب کے پیر کی جوتی تھی۔ آج ان سب کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ اسے وقت وقت کی بات کہتے ہیں۔

جوئی کسی بے جان مورتی میں ڈھلی بیٹھی تھی جب دو عورتیں اسے پکڑ کر لباس بدلوانے، منہ دھلوانے لے گئی تھیں۔ تب کمرے میں پھر سے صف ماتم بچھ گئی۔ ماہی پچھاڑ کھا کے بے ہوش ہو گئی۔ آخر اس کی گناہ گار آنکھوں نے یہ سب بھی دیکھنا تھا۔ کشی اور دی رونے لگی تھیں بچے الگ سہم رہے تھے جبکہ عسمی گم صم اور خاموش تھی، چپ چاپ ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھی۔ یہ تقدیر کا مذاق نہیں، انصاف تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ جس لڑکی کی یتیمی کو انہوں نے رول دیا۔ جس کا بچپن چھین لیا اور جس کا لڑکپن چولہے میں جھونک دیا۔ ذلت، مار، دھتکار جسے تحفے میں دی جاتی

تھی۔ آج وہی لڑکی عسمی کی راجدھانی میں حصہ دار بننے جا رہی تھی۔ اللہ کس کس طرح سے بندے کے غرور کو توڑتا ہے۔ عسمی بھبھک بھبھک کر رونے لگی۔

پھر جب چاندی میں ڈھلی اس چینی کی مورت کو سجا بنا کر لایا گیا تو سب کی آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ گندی بدبودار، میلی کچیلی جوئی تو لگ نہیں رہی تھی۔ کوئی حور شمائل تھی یا نازک سی پری۔۔۔ ان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ دل میں حسد، کینہ، بغض اور حقارت اٹھ اٹھ آئی۔ کاش کہ اس لڑکی پر گرم تیل یا تیزاب پھینکا جا سکتا۔ کچھ دیر بعد ملا صاحب آ گئے۔ گونداز خان اکڑ اکڑ کر برابر چل رہا تھا۔ آج تو اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ کیا ٹھاٹ باٹ تھے اس کے۔۔۔ بیوی کے میکے میں بیٹھ کر اسی پہ سوکن لا رہا تھا اور جوئی کو دیکھ کر تو اس کے تیور ہی بدل گئے۔ اس کی ہوس زدہ نظریں جوئی کے آر پار اترنے لگیں۔ وہ ملا کو ٹھوکا دے کر بے تابی سے بولا۔

"جلدی سے نکاح پڑھا دو۔" جوئی کی اتری صورت اور پتھر وجود کو دیکھ کر وہ خدشوں کا شکار تھا۔ اس لیے رسمی کارروائی سے جلد از جلد جان چھڑوانا چاہتا تھا۔ ایک عورت "اندر سے" کی طشتری اٹھا لائی تھی۔ خاص قسم کی مٹھائی تھی جو رواج کے مطابق نکاح کے وقت بانٹی جاتی۔ چاول کے آٹے سے بنتی تھی۔ پھر گھی میں تلی جاتی۔ ہر طرف تازہ مٹھائی کی مہک تھی۔ کچھ دوشیزائیں "اک تارا" پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ گونداز خان نے انہیں ڈپٹ کر، جھاڑ کر، غصہ کر کے خاموش کروا دیا تھا وہ منہ ہی منہ بدبداتی باہر نکل گئی تھیں۔ پھر ملا صاحب نے کارروائی شروع کی۔

تب ہی ایک عورت حواس باختہ اندر آئی۔

"خان! عسمی نے زہر پھانک لیا۔" وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ گونداز خان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ بل کھاتا باہر کی طرف لپکا تھا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ عسمی کا گلا ہی دبا دے۔ کیسی منحوس عورت تھی۔ نکاح کی گھڑی میں بدشگونی اور نحوست پھیلا گئی۔ مگر

عسمی کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور جسم بے آب مچھلی کی طرح جھٹکے کھا رہا تھا۔

گونداز خان کو اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانا پڑا۔ آخر وہ اس کے پانچ لڑکوں کی ماں تھی۔ وہ لڑکے جو اس کے وارث تھے۔ گونداز خان کو زمان و مکاں بھول گئے۔ اور ادھر نکاح کی کارروائی ادھوری رہ گئی۔ عسمی کی خودکشی جیسے بھونچال لے آئی تھی۔ ماہی، دی، کشی روتی پیٹتی ساتھ ہو گئیں۔ بچے تڑپتے، روتے بلکتے بت بنی جوئی سے لپٹ گئے تھے اور جوئی جیسے پھانسی کے تختے سے اتر آئی تھی۔ اس نے بلکتے بچوں کو دلاسا دیا۔ انہیں پیار کیا۔ ایک ایک لڈو پکڑایا اور خود کپڑے بدلنے چل دی۔ عروسی لباس کو نوچ کھسوٹ کر خالی گگرے میں ٹھونس آئی۔ زیورات اتار کر پھینک دیے تھے۔ اس کا روم روم عسمی کے لیے دعا گو تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب ان کی واپسی ہوئی۔ عسمی کی حالت بہتر تھی۔ تاہم ابھی ہسپتال میں تھی۔ ماہی اور گوشی خان نہیں آئے تھے۔ کشی اور دی تھیں۔ وہ بچوں کو کھینچ گھسیٹ کر اسے نفرت سے دیکھتی اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔۔۔ جوئی مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ رات کے اس پہر وہ تانی کی رضائی میں گھسی عسمی کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔

معاً لکڑی کا کواڑ چرچرانے کی آواز آئی تھی۔ بڑا قدیم کواڑ تھا۔ جس کے کندھے بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ چٹخنیاں بھی نہیں تھیں۔ کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ ایک زرد اکلوتا بلب تھا۔ جو پچھلے سال جالا اتارتے ٹوٹ گیا تھا۔ پھر کسی کو بلب لگانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی اور اس وقت گھپ اندھیرے میں کوئی دبے قدموں چلتا ہوا چارپائی تک لے آیا۔ اس نے لحاف کھینچ کر اندر دبکی تھر تھر کانپتی جوئی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبالیا۔ اب وہ اسے گھسیٹ کر اٹھا رہا تھا۔ اس کی گرفت سخت تھی اور کھردرے ہاتھوں سے اس کے مرد ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ جوئی کا دل حلق میں آ گیا، اس کی چیخیں

گھٹ گئیں۔

کیا گوشی خان؟ وہ لوٹ آیا تھا؟ اس کی آنکھوں میں صبح کا منظر چبھنے لگا۔ رسوئی میں موجود گوشی خان، پلید اور نجس نگاہ سے دیکھتا ہوا۔ تو کیا ابھی وہ پھر اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیے آیا تھا؟

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی۔ مگر وہ ذلیل اسے پچھواڑے کے ایک کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس قدر شدید اندھیرا تھا کہ آنکھیں پھاڑنے سے بھی کچھ نظر نہ آتا۔

معاً اس کے منہ کو آہنی شکنجے نے آزاد کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس دیو ہیکل وجود سے دور ہٹی تھی۔ اسی پل کمرے میں زرد بلب کی روشنی پھیل گئی تھی۔ پھر جوئی نے سامنے کھڑے وجود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ وہ گوشی خان نہیں گونداز خان تھا۔ جوئی جیسے تھر تھر کانپنے لگی اور وہ اسے کانپتے دیکھ کر خباثت سے مسکرایا تھا۔

"آ۔۔۔ ہا، سہمی چڑیا! بہت مہنگی پڑی ہو مجھے! شہر میں دس کنال زمین دے کر گوشی خان سے تمہیں خریدا ہے۔ بڑا مکار سودے باز تھا۔ پکے کاغذ پہ لکھوا گیا اور بہن نے زہر پھانک کر نکاح کو التوا میں ڈال لیا۔ چلو یوں ہی سہی۔ نکاح آج نہیں تو کل ہو جائے گا۔ مگر گونداز خان "ملکیت" آج ہی اپنے نام کروائے گا۔ اب نہ ہوشیاری دکھانا نہ شور مچانا۔۔۔ ورنہ انجام برا نہیں، بہت بدترین ہو گا۔ پھر میں تم سے نکاح نہیں کروں گا۔ تمہارا بیوپار کروں گا۔ تمہیں ہر روز بیچوں گا۔ تمہاری بولی لگواؤں گا۔ خود سوچ لو ایک چپ میں بے شمار سکھ ہیں۔"

مونچھیں مروڑتا ایک ایک قدم چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے بچانے کے لیے اب کسی نے نہیں آنا تھا۔ اللہ نے اسے ایک موقع دیا تھا۔ وہ موقع جوئی گنوا چکی تھی۔

اس کے ہاتھ جوئی کی گردن کو چھونے لگے تھے، نرم نازک جلد کی ملائمت کو محسوس کرنے لگے تھے، عنابی رنگ میں دہکتی مومی گڑیا آنکھیں میچے خوف سے

پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کا خوف گونداز خان کے لطف کو بڑھا رہا تھا۔ وہ اس کے نرم گالوں کو چھونے لگا۔ جوئی خوف زدہ سی کچھ اور پیچھے کی طرف کھسکی تھی پھر چھال سے بھرے کٹھڑیہ جا گری۔ وہ جانور اس پہ جھکنے لگا تھا جب ایک دم بلبلا تا ہوا پیچھے ہٹا۔

اس کے دیو ہیکل وجود کے پیچھے انسانی ہیولا کھڑا تھا۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا۔ جس کے ہاتھ میں وزنی پلاس تھا۔ وہی پلاس یکے بعد دیگرے گونداز خان کے سر پہ برسنے لگا۔ ٹھک ' ٹھک ' ٹھک ــــ اس کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے تھے۔ اس کا منہ ' ماتھا ' ناک خون سے بھر گیا۔ سر کی سخت ضرب نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ وہ اٹھ کر حملہ آور کو دبوچنے کے قابل نہیں رہا تھا بلکہ کسی رینگنے والے کیڑے کی طرح زمین پر ڈھے گیا تھا۔ وہ منہ کھولے کراہ رہا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا لہو اس کے منہ پر گر رہا تھا۔

سیاہ لبادے والے ہیولے نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر وقت ضائع کیے بغیر وہ دونوں کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے کی حدود سے نکل گئے۔ اس کے ساتھ موجود انسانی ہیولا مرد تھا یا عورت؟ جوئی جان نہ سکی۔ وہ بھاگتی بھاگتی آلو بخارے کے باغ میں آ گئی۔ اس کے پیچھے آنے والے آسیب بہت ہی پیچھے رہ گئے تھے۔

جبکہ برابر بھاگتا ہیولا بھی رک گیا تھا۔ گھپ اندھیرے اور مہیب سناٹے میں جوئی نے ایک بہت اپنائیت بھری آواز سنی تھی یہ آواز کس کی تھی؟ وہ لمحوں میں پہچان گئی۔

"بخت گل تم۔" جوئی کے ہونٹ پھڑپھڑا گئے تھے یہ بخت گل تھی جوئی کی آنکھیں بہنے لگیں۔ وہ بخت گل سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

"رونا نہیں ..... رونے کے دن گئے' تم اب واپس نہیں جاؤ گی۔ پل کے پاس خان کھڑا ہے۔ وہ کان والا۔ وہ تمہیں پنڈی پہنچا کر آئے گا۔ اس پہ بھروسا کر لینا۔ تیری طرف میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔" بخت گل نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

جوئی عمر بھر اس کا احسان نہیں اتار سکتی تھی۔ اس نے جوئی کی عزت بچائی تھی۔ اسے سہارا دیا تھا اس کی مدد کی تھی۔ مختصر الفاظ میں بخت گل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کیسے جوئی کو لینے نانی کے کمرے میں پہنچی۔ اس کے نکاح کی خبر سن کر وہ منصوبہ بنانے آئی تھی مگر جوئی کو کمرے میں نہ پا کر چونکی ہو گئی۔ پھر جلد ہی اسے پچھواڑے سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ وہ اندازے سے پیچھے کی طرف آئی تھی۔ پھر اس شیطان کو دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ جوئی کو بچانا تھا' اللہ نے اسے وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ اور اللہ بہترین وسیلے بنانے والا ہے۔

"اب جا بھی خان انتظار کر رہا ہو گا۔" بخت گل نے اسے پگڈنڈی کی طرف دھکیلا تھا۔ تب جوئی نے بھرائی آنکھوں سے اندھیرے میں بخت گل کو دیکھنا چاہا۔ وہ اس کی محسنہ تھی۔ پوری دنیا میں ڈاکٹر چاچو کے بعد صرف ایک واحد ہستی' جو اس کا بھلا چاہتی تھی۔ جو عادتاً" اچھی نہ سہی مگر فطرتاً" بری نہیں تھی۔ جو اسے زندگی کا ایک نیا سبق پڑھا رہی تھی۔

"ہمیشہ بات کے مثبت پہلو کی طرف غور کرو۔ منفی پہلو خود بخود پس منظر میں چلے جائیں گے۔" اس نے اندھیرے میں ہاتھ ہلایا تھا' جو جوئی کو نظر نہ آ سکا۔ وہ اس کی بازگشت سنتی جا رہی تھی۔

"زندگی میں ناکامیاں اس لیے آتی ہیں ــــ تاکہ وہ اپنے بعد آنے والی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔" آلو بخارے کے باغ میں کھڑی لڑکی بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ جوئی کے قدم لحہ بھر کے لیے رک گئے۔

"مجھے ڈر ہے۔ گونداز خان کو پتا نہ چل جائے۔ زخمی درندہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" جوئی اپنا خوف کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اسے بخت گل کی فکر تھی۔

"اس کے باپ کو بھی نہیں پتا چلے گا۔" وہ اپنے لبادے کی وجہ سے مطمئن تھی۔

"اب چلی جاؤ اور کبھی بھی پیچھے لوٹ کر مت آنا تمہارے حصے کے موسم گل تمہیں پکار رہے ہیں۔"

بخت گل کی آواز نمی میں ڈوب گئی تھی۔

وہ پگڈنڈی پہ بھاگتی جا رہی تھی۔ پیچھے مڑے بغیر' دیکھے بغیر داہنے بازو پہ بندھی تھیلی میں موجود اس تصویر والے کے بھروسے پہ جسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے آلو بخارے کے باغ میں دیکھا تھا۔ وہ شخص جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ وہ جو اس کی زندگی کا پہلا اور آخری خواب تھا۔ وہ جو اس کے لیے پوری حیات تھا' اس کے دل کی بڑی انمول کتاب تھا۔ سیاہ آسمان پہ چمکتا مہتاب تھا۔ عذاب لمحوں کا سراب تھا' اندھیرے رستوں میں روشنی کا مینار تھا' چمکیلا ' روشن ' تاباں اور درخشاں۔

آج بھاگتے بھاگتے جوئی کو کوئی ٹھوکر نہ لگی ' نہ وہ گری ' نہ وہ سنبھلی نہ وہ اٹھی۔ بس بھاگتی رہی بغیر رکے بغیر مڑے۔ دھند کے پار جیسے عدل کبیر خان کھڑا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے داہنے بازو پہ ہاتھ رکھا۔ تھیلی میں اک تصویر اور خستہ سا پیلا پڑتا کاغذ محفوظ تھا۔ اس کے اور عدل کے نام سے سجا جیسے عدل کے نام سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ زمانے کی ہر خوشی اس خستہ حال کاغذ کے سامنے ہیچ تھی۔ جس پر عدل کا اور اس کا نام لکھا تھا۔

تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر' حرف ابجد میں
نہیں ہیں۔
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر ان کی نگاہوں نے
تمہارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوا نے منظروں پر آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے
تمہارے نام لکھا ہے
خط میں ٹوٹتے تارے
تمہارے بام سے گزریں تو رکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چومتے جذبے
تمہاری آنکھ سے اتریں تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تمہارے "خواب" سے روشن منارے
وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں
تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں
نہیں ہیں!

دھند میں کھویا پل اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مورکھ کی حسین پہاڑیاں دور رہ گئی تھیں۔ دھند میں کھویا آلو بخارے کا باغ اسے اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بہتی رواں ندی اس کے لیے دعائے خیر کر رہی تھی۔ کھلا آسمان اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔ بہت سے کریہہ ' دردناک ' خوفناک منظر پیچھے رہ گئے تھے ' ایک ذلت بھری زندگی کا طوق اس کے گلے سے پھسل کر گر پڑا تھا۔ مشقت بھرے دن رسوئی میں جاگ جاگ کر گزاری راتیں' وہ کھوئے کا کڑاہا ــــ سب پیچھے رہ گیا۔ اس کی زندگی کے ایک بھیانک دور کا اختتام ہو گیا تھا۔

مگر اس کی زندگی کا دوسرا بھیانک دور شروع ہو گیا تھا

البیلے سنہرے خوابوں کے جگنوؤں کو سنبھالتی اس لڑکی کو خبر کہاں تھی؟

☆ ☆ ☆

اینٹ کا اینٹ سے ربط ختم ہو جائے تو دیواریں اپنے ہی بوجھ سے گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا مسرتوں سے ربط ختم ہو جائے تو زندگی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ مگر بعض غم بہت وزنی ہوتے ہیں' ان کا بار پہاڑ تک اٹھا نہیں پاتے۔ وہ ایسے ہی رنج و غم کا شکار تھا۔ ایسے ہی ایک ملال کی گرفت میں تھا۔ کاش وہ اتنا لاپروا نہ ہوتا' کاش اپنی کامیابیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے ہوئے وہ اتنا غافل نہ ہو جاتا۔

زندگی کی سب سے بڑی خوشی پا کر بھی وہ ادھورا تھا۔ فارن سروسز کا خواب پورا ہو جانے کے باوجود بھی وہ خوش نہیں تھا۔ ماسن کے ملنے کا یقین رکھنے کے باوجود بھی مطمئن نہیں تھا۔

یہ ادھورا پن ایک شخص کے اچانک چلے جانے کی بدولت تھا۔ اسے اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی

یقین نہ آتا۔ وہ دیوانوں کی طرح پورے گھر میں بولایا بولایا پھرتا تھا۔ کبھی گھنٹوں اسٹڈی روم میں گھسا روتا رہتا' کبھی لان میں تنہا جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔ وہ اس غم سے سنبھل نہیں پا رہا تھا۔

غفیرہ کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ عدل ان کی واحد اولاد اور آخری سہارا تھا۔ وہ اسے گھٹ گھٹ کر جیتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مامن کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ نارمل نہیں ہو پا رہا تھا۔

ابھی اسے جوائننگ لیٹر نہیں ملا تھا ورنہ اسی مصروفیت میں کچھ بہل جاتا۔ وہ عدل کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھیں۔ یہی حال مامن کا بھی تھا۔ وہ اب پوری طرح سے صحت یاب تھی۔ مامن اتنے شدید حادثے کے بعد بھی پہلی پوزیشن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ عدل نے اس کی خوشی کو سیلیبریٹ نہیں کیا تھا' وہ تو اپنی کامیابی پہ بھی کوئی رسپانس نہیں دے پایا تھا۔

دن ایسے ہی اداس ویران اور بوجھل گزر رہے تھے۔ گھر پر خاموشی اور سناٹے کا ہی راج رہتا' مامن نے یونیورسٹی کو خیرباد دیا تھا وہ زیادہ سے زیادہ عدل کو وقت دیتی تھی۔ اسے زبردستی گھسیٹ کر لاؤنج میں لے آتی' کبھی آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیتی' کبھی لانگ ڈرائیو پہ نکل جاتی' اس کے پاس بیٹھ کر اسے ٹیکسٹ کرتی' اپنی طرف متوجہ کرتی اسے بولنے پہ اکساتی' پھر تنگ آ کر اکثر رونے لگتی۔ وہ عمر بھر توجہ لیتی آئی تھی اب عدل کی بے توجہی اسے پہروں رلاتی' وہ شکوے کرتی' ناراض ہوتی' غصہ کرتی' روٹھتی اور پھر مان جاتی۔

اکثر تو مامن کے ہر وقت سر پہ سوار رہنے کی وجہ سے وہ اکتا جاتا تھا۔ خفا ہونے لگتا' تنہائی چاہتا' تب مامن بہت بددل ہو جاتی تھی' خفا ہونے لگتی' عدل سے نہ بولنے کی قسم کھاتی' اور پھر اپنی قسم کو خود ہی توڑ دیتی۔ عدل کے تنفر اور وحشت کو دیکھ کر اسے ترس آنے لگتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر عدل کے آس پاس گھومنے لگتی' وہ چاند کے گرد گھومنے والی چکور تھی۔

ایسی ہی ایک غضب کی اداس شام عدل اسٹڈی روم سے نکل کر غفیرہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سوجی آنکھیں' بکھرے بال' اداس چہرہ' سلوٹ زدہ کپڑے۔ غفیرہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ کیا یہ ان کا نک سک سے تیار رہنے والا بیٹا تھا۔

"میری جان! تم تو ماں کو بھی بھول گئے۔" بے ساختہ ان کے لبوں سے شکوہ پھسل پڑا تھا۔ تب عدل نے بڑی زخمی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو "بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔"

"بیٹے! خود کو سنبھالو اب۔ تمہیں تو مجھے سنبھالنا تھا جبکہ تم خود ہی حواس چھوڑ بیٹھے ہو۔" انہوں نے دکھ سے کہا تھا۔ تب عدل ان کی گود میں اپنا سر رکھ کر سسک پڑا تھا۔

"مما! وہ کیسے چلے گئے؟ وہ بیمار کہاں تھے! انہوں نے بتایا ہی نہیں۔ میں خود ان کے ساتھ جاتا۔ میں آخری وقت ان کے قریب رہتا' میں کتنا بدنصیب ہوں۔" بہت دنوں بعد وہ دل کی بھڑاس اور غبار کو نکالنے کے قابل ہوا تھا۔ جیسے اپنے اندر موجود ملال کے غبار کو باہر نکالنا چاہتا تھا۔ یہ ملال جو کسی نوکیلے کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ اذیت دے رہا تھا۔

"وہ تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تم ان کے ساتھ جاتے تو امتحان نہ دے پاتے۔ شاید اسی لیے میری جان! اب ان کی روح کو تکلیف مت دو' وہ تمہیں ذرا بھی دکھی یا غم زدہ نہیں دیکھ سکتے تھے' یاد کرو۔" غفیرہ نے پھر جذباتی انداز میں اسے سمجھایا تھا۔ ایسے ہی بابا کی یادوں کا ذکر کرتے اچانک اسے خیال گزرا تو وہ بے قرار سا اٹھ بیٹھا تھا۔

"مما! مورکھ اطلاع دی تھی کیا؟" اس کا سوال بہت غیر متوقع تھا۔ یوں کہ غفیرہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئی تھیں۔ آخر اسے مورکھ کا خیال کیسے آ گیا تھا ان کے اندر پھر سے دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

"ہاں۔" بہت دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر انہوں نے سنبھل کر جھوٹ کا سہارا لیا۔ اگرچہ ہلال کبیر کی ڈائری میں مورکھ والوں کا فون نمبر موجود تھا مگر انہوں

نے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مورکھ والوں کو بلا کر انہوں نے اپنے گلے میں مصیبت نہیں ڈالنا تھی۔ اگر وہ ساتھ اس طوق کو بھی اٹھا لاتا تب؟ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔

"پھر وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟ بابا کی چاچی! ان کی فیملی؟ اور بابا کی بھتیجی۔۔۔ کوئی بھی نہیں آیا۔" ایک اور متفکرانہ سوال آیا تھا۔ وہ اتنا بے چین اور بے قرار کیوں تھا؟ غفیرہ کے اندر گرہیں پڑنے لگیں۔

"ان لوگوں کے ہلال کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ میرا خیال ہے وہ اسی لیے نہیں آئے۔" انہوں نے جان بوجھ کر مختصر بات کر کے گفتگو کو سمیٹنا چاہا تھا مگر وہ بال کی کھال اتارنے لگا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھنسائے عجیب بے چینی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"وجہ کیا تھی؟ تعلقات کیوں خراب تھے؟ مما! بابا نے اس بارے میں ہمیں کیوں نہیں کچھ بتایا اور آپ کو پتا ہے' میں مورکھ گیا بھی تھا مگر واپس آ گیا۔۔۔ جب موی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔۔۔ بعد میں مصروفیت' ایگزامز' انٹرویو' پھر بابا کی اچانک ڈیتھ۔۔۔ کیا مجھے وہاں جانا چاہیے؟" عدل بے ربط سا بول رہا تھا۔ ان کے اندر آندھیوں کے جیسے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"تمہیں وہاں کیوں جانا چاہیے؟ اگر تمہارے بابا چاہتے تو خود تم سے کہتے یا پھر تمہارے لیے ایسا کوئی میسج چھوڑ جاتے۔ تمہیں تاکید کرتے۔ مگر انہوں نے تم سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے خاندان سے تمہیں دور رکھنا چاہتے تھے۔" غفیرہ نے اندر اٹھتے غبار کو بمشکل دبا کر نرمی سے کہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر تنفر کا مظاہرہ کر کے عدل کو چونکانا نہیں چاہتی تھیں۔

"کیا خبر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں' مگر انہیں مہلت نہ ملی ہو۔" عدل ایک مرتبہ پھر کسی لمحے میں کھو گیا تھا۔ غفیرہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر سہم رہی تھیں۔ عدل اگر ایک دفعہ مورکھ چلا جاتا تو پھر۔۔۔ ان کے اندر قیامت کا شور اٹھنے لگا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں میری جان! تم خود کو ذہنی دباؤ سے نکالو۔ کچھ دن بعد اپنی عملی زندگی میں قدم رکھو گے۔ پھر اللہ نے چاہا تو تم دونوں کی شادی۔" وہ کچھ مزید بولتے بولتے اچانک رک گئی تھیں۔ یہ وقت شادی کی بات کے لیے بڑا غیر مناسب تھا۔ اسے یہ بات بری بھی لگ سکتی تھی۔ مگر شاید اس کا دھیان ان کی گفتگو کے اتار چڑھاؤ کی طرف نہیں تھا۔ وہ پیشانی کو ٹھوکا دیتے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"بابا کے اسسٹنٹ واجد صاحب۔۔۔ ان کے ساتھ ہی امریکہ گئے تھے نا؟ اور پھر پچھلے دنوں کچھ سامان لے کر آئے تھے؟ بابا کا سامان' ہے نا؟ اس میں کیا تھا مما؟ مجھے یاد پڑتا ہے۔۔۔ واجد صاحب نے کہا تھا۔ یہ عدل کی امانت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عدل کے لیے خاص طور پہ دیا ہے۔ واجد صاحب وہ سامان میرے حوالے کرنے پہ بضد تھے۔ اور تب میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ مما! وہ بریف کیس کہاں ہے؟ اس میں میرے لیے خاص کیا تھا؟ بابا نے آخر میرے لیے کیا دیا؟ جو وہ خود نہیں دے پائے۔"

وہ اپنے آپ میں گم جیسے خود کلامی کرتے ہوئے چونک پڑا تھا۔ پھر سرخ ڈوروں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ان کے بگڑتے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ایک نہایت تند اور بے رحم سی لہر نے ان کے دل میں اٹھی تھی۔ وہ تنفر کے اس طوفان کو بمشکل دباتی اپنے حواسوں میں واپس آئی تھیں۔ انہیں عدل کو جواب دے کر مطمئن بھی تو کرنا تھا۔

"آں۔۔۔ ہاں یاد آیا۔۔۔ میں تمہیں بتا نہیں سکی۔ تمہاری حالت بھی تو کچھ ایسی تھی۔ بیٹا! وہ پراپرٹی کے ڈاکومنٹس تھے۔ اس گھر کے کاغذات جو انہوں نے تمہارے نام کر دیا تھا اور ہسپتال میں شیئر کے حوالے سے انفارمیشن تھی۔ اس کے علاوہ بینک بیلنس کے متعلق تفصیلات تھیں۔ چونکہ یہ سب تمہاری امانت ہے سو واجد صاحب تم ہی کو دینا چاہتے تھے۔" ان کے مدلل' نرم اور تفصیلی جواب نے عدل کو کچھ مطمئن کر

دیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت شکستہ تھا' اسی لیے کچھ غور ہی نہ کرپایا۔ ورنہ اتنا تو سوچ سکتا تھا کہ ہلال کبیر کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے ان کی پراپرٹی کا وارث وہ ہی ہے۔ اس کے لیے انہیں خاص ہدایات کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر اس بریف کیس میں کیا تھا؟ جو غفیرو نے عدل سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اور پھر واجد صاحب سے اس کی ملاقات بھی نہیں کروائی۔ وہ واجد صاحب سے ملاقات کا خیال ظاہر کرتا اٹھ گیا تھا مگر غفیرو نے ایک مرتبہ پھر اسے روک لیا۔

"واجد صاحب اپنی فیملی کے ساتھ واپس چلے گئے ہیں۔ جانے سے پہلے ملنے آئے تھے۔" انہوں نے بہت آرام سے اس کی امید بھی توڑ دی تھی' وہ جو واجد صاحب سے ملاقات کا سوچ کر مطمئن ہو رہا تھا کہ کم از کم وہ ان سے اتنا تو پوچھ سکے گا' بابا آخری وقت تنہا تو نہیں تھے؟ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں' عدل کے لیے کوئی خاص پیغام' ہدایت؟ وہ جیسے بجھ کر رہ گیا تھا۔ بابا سے علاقہ' تعلق' واسطہ رکھنے والا واحد شخص بھی بیرون ملک چلا گیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آگرا۔

"اور ان کا کوئی کانٹیکٹ نمبر؟" جیسے پھر سے امید کی کونپل پھوٹی تھی۔

"ان کا کوئی نیا نمبر میرے پاس نہیں ۔۔۔ اب تم آرام کرو عدل! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں' دیکھو۔ تمہاری وجہ سے مامن بھی بجھ کر رہ گئی ہے۔ تم اسے وقت نہیں دیتے' بات نہیں کرتے' دیکھتے تک نہیں۔"

انہوں نے بہت خوب صورتی کے ساتھ مامن کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جبکہ اس کے ذہن پر بہت سی پرچھائیوں کی چھاپ تھی۔ وہ باپ کے "حوالوں" کا سوچ رہا تھا۔

اسے سلونی کہر میں گم ایک شام کا منظر یاد آیا۔ اسے مورکھ کا پل یاد آیا۔ اسے بہتی ندی کا سکوت یاد آیا۔ اسے سفید پہاڑوں کا سوگ یاد آیا۔ اسے آلو بخارے کا باغ یاد آیا۔ اور ساتھ اسے مخمل سے ایک چہرے کا کرب یاد آیا۔ جیسے سرخ رنگ کے ملائم پھول کی ہر پتی کرب سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ جیسے کوئی زندگی دھیرے دھیرے مرجھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھوں کے سامنے سفید انڈے جیسا ولا تھا۔ سفید پھولوں اور سبز بیلوں سے گوندھا ہوا اس کے چاچا صاحب کا آشیانہ ۔۔۔ جو ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور جس گھر کو خالہ کا غلیظ' ناپاک نجس شوہر ساڑھے تین' چار ماہ میں بھی ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ وہ اس بوڑھے ڈرائیور نے ایک گھنٹے میں ڈھونڈ لیا تھا۔

یہ وہی آشیانہ تھا جس کا پتا اس کے دل پر نقش تھا۔ وہ ڈاکٹر چاچو کو اسی پتے پہ خط لکھا کرتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی سلور بھاری گیٹ تک آئی۔ وہ بے یقین کھڑی تھی۔ اس نے انگلی کی پوروں سے سنگ مرمر کی تختی پہ کھدے نام کو چھوا ۔۔۔ "ڈاکٹر ہلال کبیر خان" تھے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ڈاکٹر ہلال کبیر کے گھر سامنے کھڑی تھی۔ کاش کہ ڈاکٹر چاچو خود بھاری دروازوں کے دونوں پٹ اس کے لیے وا کرتے۔ کاش کے ڈاکٹر چاچو اپنے محل کے کسی کونے سے نکل کر اسے حیران کر دیتے۔

معاً" چوکیدار کا کیبن کھلا' بڑی مونچھوں والا خان بلبلاتا ہوا اپنے بل سے باہر نکلا۔ ایک تڑپ تڑپ کر روتی لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کچھ حیران ہوا' زیادہ مشکوک ہوا۔

"اے لڑکی! کون ہو تم؟ ادھر کیوں کھڑا ہے تم؟" کرخت لہجہ' کرخت چہرہ۔ وہ اسے مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا۔

"مجھے تمہارے صاحب سے ملنا ہے۔" جوئی کو ہمت کرنا پڑی۔ اس نے سسکتے ہوئے بمشکل کہا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

"اوئی ۔۔۔ اللہ کی بندی! تم کو معلوم نہیں ۔۔۔ صاحب تو چل بسا۔ چار مہینے پہلے' تابوت میں بند ہو کر آیا۔ اپنے پیروں پہ چل کر علاج کروانے گیا تھا۔ بس حکم الٰہی۔" چوکیدار کا منہ اتر گیا۔ وہ ایک دم دکھی نظر آنے لگا جوئی کو چکر آگیا تو اس کے سارے وہم سچ ثابت ہو گئے' ڈاکٹر چاچو تاقیامت ۔۔۔ دنیا سے پردہ پوش ہو گئے۔ اس سے بغیر ملے چلے گئے۔ اسے بنا دیکھے چلے گئے۔

وہ ٹھنڈی زمین پر دو زانو بیٹھی اور تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ چوکیدار گھبرا گیا۔ جانے کیسی چوٹ لگی تھی بے چاری کے دل پر' وہ اندر کی طرف بھاگنے لگا' پھر پلٹ کر اس کی طرف آیا۔

"اللہ کی بندی! اوئی ماں! چپ تو کر' مت رو ۔۔۔ میں اندر صاحب کو بتاتا ہوں۔ تیرا کوئی نام بتا ہے؟" چوکیدار ہکلا گیا تب جوئی نے زخمی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ چوکیدار کے پیچھے کوئی ہیولا کھڑا تھا' کوئی سایہ کھڑا تھا یا کوئی سائبان کھڑا تھا۔ وہ یک ٹک دیکھتی رہی' جیسے کوئی واہمہ' ہو ۔۔۔ کیا وہ اتنی اقبال مند' خوش نصیب تھی جو اس چہرے کو اتنے قریب سے دیکھ پاتی۔

وہ دیوانہ وار اسے دیکھتی رہی' کسی قیمتی منظر کی طرح' جو پلک جھپکنے کی دیر میں اوجھل ہو سکتا تھا۔ جوئی نے وہ بھاگوان لمحہ ضائع نہ کیا۔ اس نے کسی خواب کے سفر میں ڈولتے ہوئے کہا۔

"خان! عدل سے کہو جزا آئی ہے۔" جوئی کے لب پھڑپھڑائے تھے' اس نے سامنے کھڑے ہیولے میں واضح طور پہ حرکت محسوس کی تھی۔ وہ جیسے مضطرب ہوا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اس نے مخمل سے چہرے والی لڑکی کو دیکھا' جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ وہ آنسو جو اسے دیکھ کر جم گئے تھے' وہ آنسو جو اس کے قریب آنے پر پھر سے پگھل گئے تھے۔

عدل کو بہت کچھ یاد آیا تھا ۔۔۔ ندی کا وہ پل' دھند میں کھویا آسمان' سفید پہاڑوں کی بلندی' آلو بخارے کا باغ ۔۔۔ اور مخمل سا منجمد ہوا وہ چہرہ ۔۔۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا' یہ جزا ہی تھی جزا کبیر خان' اس کے بابا کی جان ۔۔۔ اور عدل کبیر خان اس پہ صدقے اور قربان ۔۔۔ بابا کا عدل پہ کیا جانے والا آخری احسان ۔۔۔ یا قدرت کا انعام؟

اس کے رنج زدہ دل پہ بوندیں گرنے لگی تھیں۔ وہ ان کے چلے جانے کے بعد اس ملال کو ختم کرنے کا ایک واحد ذریعہ پا چکا تھا۔ اس کے اندر قندیلیں جل اٹھی تھیں۔ روشنیاں بکھر گئی تھیں۔

اس کے باپ کو سامنے کھڑی پہاڑی لڑکی سے عشق تھا۔ اس کے باپ کی جان اور ان کا جہان اسی لڑکی میں آباد تھا۔ وہ اپنے بابا کے چھوڑے گئے جہان کی حفاظت کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مخمل سی لڑکی کے کمزور وجود کو زمین سے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"میں عدل ہوں ۔۔۔ اور تم جزا ہو ۔۔۔ جانتی ہو' عدل کے بدلے میں جزا ملتی ہے ۔۔۔ یعنی انصاف کے بعد اس کا اجر ۔۔۔ مشکل بات ہے' سمجھ میں نہیں آئی نا؟ آج کے بعد میں تمہارا عدل ہوا۔ مجھے تمہاری تلاش تھی اور تم مجھے تلاش کرتی یہاں تک پہنچ گئیں۔ تم مجھ میں میرے بابا کو ڈھونڈنا اور میں تم سے اپنے بابا کے لفظوں کی مہک کو کھوجوں گا۔ ایک بات تو سچ ہے نا۔ بابا نے مجھ سے بھی بڑھ کے تم سے عشق کیا۔"

وہ اس کے کانوں میں امرت انڈیل رہا تھا۔ وہ اتنا پیارا اور میٹھا بولتا تھا۔ ڈاکٹر چاچو نے سچ کہا تھا۔ عدل میں ان سے زیادہ مٹھاس بھری تھی اور اس کی آنکھوں سے شہد بہتا تھا۔

"تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو ۔۔۔ میرے بابا کے لیے ہیں نا؟ آئی سویر جزا! میں بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کے کھل کر رونا چاہتا ہوں ۔۔۔ اب تم آگئی ہو نا؟ ہم دونوں اکٹھے رو لیں گے۔ میرے ساتھ بابا کے لیے اس قدر رونے والا کوئی نہیں تھا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ماربل کی روش پہ چلنے لگا۔ اور

ماربل کی روش جیسے گل کوکب سے بھر گئی۔ ڈیلیا کی پتیاں اس کے پیروں تلے بچھ گئیں۔ گل یاسمن برف کی مانند اس پہ گر رہے تھے' گل زیبا اسے سنگھار بخش رہے تھے۔ گل برگ اس کے قدم چھو رہے تھے۔ گل پیادہ مہک رہے تھے' گل چاندنی چمک رہے تھے' گل دوپہر دھند میں کھل رہے تھے' گل شبو مچل رہے تھے' گل صد برگ صدائیں لگا رہے تھے' گل عباسی مسکرا رہے تھے۔ گل شانہ جھوم رہے تھے۔ گل نیلوفر دلدل سے ابھر رہے تھے' گل احمر بکھر رہے تھے کیونکہ گل پیرہن اس کے ساتھ ساتھ تھا اس کے ہمراہ تھا' اس کے برابر چل رہا تھا۔ پہاڑوں سے آتی دردر کی ٹھوکریں کھاتی اس پہاڑی لڑکی کی زندگی کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

وہ گلاب رنگ' گلابوں میں ڈھلی لڑکی نم آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ وہ زندگی میں در آنے والے اس عجیب موڑ پر بوکھلا رہی تھی' وہ اپنے اتنے انوکھے استقبال پر گھبرا رہی تھی۔۔۔ اور وہ اپنی زندگی میں پھر سے چلے آنے والے طوفانوں کے خوف سے کپکپا رہی تھی اور وہ سنہرے خواب جیسے عدل کبیر خان کا ہاتھ تھام کر اندر جاتی اس کی سرد برف جیسی ماں کی آنکھوں میں اتری "برف" دیکھ کر پہلے ہی موڑ پر ڈگمگا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
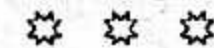
یہ اس کی زندگی کا بڑا عجیب دور تھا۔ وہ سوچتی اور حیران ہوتی' کبھی خود پر رشک آتا اور کبھی رحم آتا۔۔۔ یہ دور اس کی زندگی کا پہلا اور آخری سنہری دور تھا۔ نہایت مختصر مگر مکمل۔

اسے عدل کبیر کی توجہ' نرمی' پیار اور خلوص نے دودھ میں گندھا گلاب بنا دیا تھا۔ وہ سب کی ٹھوکروں میں پڑی لڑکی آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن گئی تھی۔

وہ جیسے دنوں میں اس کا اتالیق بن گیا۔ وہ اسے زندگی گزارنے کے قرینے سکھانے لگا' وہ اسے بولنے کے طریقے سکھانے لگا۔ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھانے لگا وہ اسے اپنے بابا کے اسٹڈی روم میں لے آتا۔ وہ جوئی کو ان کی کتابیں دکھاتا' ان کی تصویریں' ان کے میڈلز' سرٹیفکیٹ دکھاتا' پھر جوئی سے ان کی باتیں سنتا' ہر چھوٹی سے چھوٹی' بڑی سے بڑی' اسے رشک آتا جب وہ جوئی کے منہ سے بابا کی باتیں سنتا' وہ کس طرح جوئی سے پیار کرتے تھے۔ اس کے خط پر دوڑے چلے آتے۔ اسے بخار ہوتا تو کس قدر لاڈ کرتے' اس کا منہ دھلواتے' اپنے ہاتھ سے انڈا کھلاتے دوا دیتے۔

عدل کی آنکھوں میں حیرانگی' تحیر اور تعجب در آیا تھا۔ وہ اسے عقیدت سے دیکھنے لگتا' ایسی نظر جس میں محبت تھی' بڑی مقدس اور متبرک قسم کی محبت گویا اپنے باپ جیسی شفقت سے جوئی کو سرفراز کرتا تھا اور جوئی کے لیے تو محض اس کی آنکھ میں اتری نرمی عمر بھر کے زادراہ اور زیست بھر کی خوشی کے لیے کافی تھی۔

وہ جوئی کے لیے موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور وہ دنیا کا پہلا شخص تھا جو اسے جوئی نہیں جزا کہہ کر پکارتا اور اس بات پہ مامن جیسی ہستی تک کو جھڑک دیتا تھا۔

دنوں میں بدلتی اس صورت حال نے غفیرو اور مامن کے دل کو شکنجے لگا دیے تھے۔ ان کے ہوش اڑنے لگے' مامن تو کیا یامن تک چونک اٹھی تھی۔

ان دنوں اسے جزا کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا اور اس کے پیچھے پاگل دیوانی ہوتی مامن یہ سب کچھ بھلا برداشت کر سکتی تھی؟ جب بھی موقع ملتا وہ عدل سے الجھ پڑتی' پھوپھی سے بلاوجہ جھگڑنے لگتی اور کبھی کبھی جوئی کے نازک دل کو کچوکے لگانے سے بھی باز نہ آتی۔ غصے کی تیز' تو وہ پہلے بھی تھی مگر اب مزاج عموماً گرم ہی رہتا تھا۔

جوئی کو ڈاکٹر چاچو کے محل میں رہتے ہوئے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اس جادو نگری میں آ کر ابھی تک حیران تھی۔ دھوئیں سے کالی ہوتی چھت' وہ شیرے کے ٹب' دال کے ڈرم' کھوئے سے بھرے کڑاہے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ ڈاکٹر چاچو کے عالیشان گھر کا کچن تھا۔ چمکتا دمکتا۔۔۔ شفاف' صاف خوب صورت' رنگ رنگ کی چیزوں سے بھرا فریج۔ سنگ مرمر کی چمکتی صلیب۔

اسے ڈاکٹر چاچو کے گھر کی وہ دھند میں کھوئی سویر آج بھی یاد تھی۔ رات بھر ماسٹر بیڈ روم میں اسے نیند نہ آئی۔ وہ نانی کے ٹوٹے نواڑی پلنگ پہ سونے کی عادی تھی' اس کے اوپر غلیظ سی بدرنگ رضائی ہوتی۔ جس کا غلاف جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا اور چوہے اکثر ادھڑے غلاف میں گھس کر روئی پھانکتے اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ وہ بدبودار رضائی سردی روکنے کے لیے بھی ناکافی تھی' اسے تب بھی نیند نہیں آتی تھی۔ اسے اتنے آرام دہ پرسکون ماحول میں بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ فرل لگی دودھیا بیڈ شیٹ اور نرم فروالا گداز سا کمبل جس میں سے آتی بھینی بھینی خوشبو اس نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔ کمرے میں خوب صورت صوفہ اور سنگھار میز بھی تھی۔ جس کے اوپر رنگ رنگ کے قیمتی لوشنز' باڈی اسپرے پرفیومز اور رنگ رنگ کی کریمیں رکھی تھیں جن کا استعمال کرنا جوئی کے لیے محال تھا۔ اور سفید ٹائلوں سے سجا اٹیچ باتھ روم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہاں اتنے مہنگے صابن' فیس واش' ٹالکم پاؤڈر' باڈی واش اور شیمپو کی جمبو سائز بوتلیں رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک چیز چھو کر دیکھ رہی تھی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی اور اپنی زندگی میں آنے والے اس چونکا دینے' حیران کر دینے اور متعجب کر دینے والے موڑ کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر عدل ٹھٹک گیا۔ بھلا اتنی معمولی سی تبدیلی بھی کسی کو چونکا سکتی ہے۔ مورکھ میں اس کے زخموں کو دیکھ کر' جان کر بھی انجان بن جایا کرتے تھے اور یہاں عدل اتنے متفکر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم سوئیں نہیں جزا! تم ٹھیک تو ہو!" وہ اتنا فکر مند لگ رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے کچن میں آ گیا تھا۔

وہ اسے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر جوئی کو اسٹول پہ بیٹھنے سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ تب ناشتہ میز پہ رکھتی غفیرو اور پلیٹ میں رکھا چمچہ بجاتی مامن نے بہت کٹیلی اور نفرت انگیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ عدل پہ انہیں غصہ تھا جبکہ جوئی کے لیے ان دونوں کی نظروں میں حقارت بھری تھی۔ وہ پہلے ہی وار میں ان کی نگاہوں کے تمسخر سے لڑکھڑا گئی تھی تب ہی اسٹول سے گرتے گرتے بچی۔ شاید وہ گر ہی پڑتی' زمین بوس ہو جاتی اگر عدل اسے سہارا نہ دیتا اور جب عدل نے اسے سہارا دے کر دوبارہ اسٹول پر بٹھایا تب بظاہر نرم اور ہلکے پھلکے لہجے میں غفیرو نے گہرا کاٹ دار طنز کیا تھا۔

"میری جان! اسے ٹیبل مینرز کہاں آتے ہیں؟ اس کے لیے دری بچھوا دیتے یا کارپٹ پہ بیٹھ کے ناشتہ کر لیتی۔ ادھر پیڑھی وغیرہ تو ہے نہیں۔"

انہوں نے مامن کا من پسند ناشتہ شہد اور دودھ میں بھیگے توس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ مامن کے اندر جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

اس کا کم سن معصوم حسن' جیسے شگفتہ سا پہاڑی گلاب نم نم بھیگا بھیگا سا۔ کل جب وہ آئی تھی تب انتہائی غلیظ' گندی اور اجڑی پجڑی لگ رہی تھی ٹوٹی چپل اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے۔ جو دھول مٹی سے اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔ پھر ان کے لمحوں میں باؤلے ہوتے بیٹے نے سب کچھ منٹوں میں بدل دیا۔ وہ مامن کا نیا نکور سوٹ اور سوفٹی اٹھا لایا۔ اسے زبردستی سکینہ کے ساتھ واش روم میں فریش ہونے بھیجا۔۔۔ اور پھر کچھ ہی گھنٹوں میں وہ گندی سندی غلیظ لڑکی دھلا ہوا گلاب بن کر سامنے آ گئی۔ سکینہ نے اسے باڈی واش اور شیمپو وغیرہ دیا تھا۔ تب ہی تو اس کے لمبے گھنے بال دھل دھلا کر چمک اٹھے تھے۔

عدل اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ وہ اسے یہاں سے نکال نہیں سکتی تھیں ہاں یہ ضرور ہو سکتا تھا۔ اسے میٹھے میٹھے طعنے مارتیں' اس پہ شیرے میں ڈبو کر طنز کرتیں۔ اسے احساس کمتری سے کبھی نکلنے نہ دیتیں۔ اس کے اندر کبھی اعتماد نہ آنے دیتیں اور اسے یہ بات باور کروا دیتیں کہ عدل کی ہمدردی'

ترس' اور رحم کو کچھ اور ہرگز مت سمجھے۔ اور یہ کام وہ پوری دل جمعی کے ساتھ کر رہی تھیں۔

"ہمارے ساتھ رہے گی' تو سیکھ جائے گی۔" عدل کے الفاظ نے انہیں مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔ وہ لب بھینچ کر ضبط کرنے لگیں۔

"کیا یہ عمر بھر یہیں رہے گی؟" ماہمن انگریزی میں چیخی تھی۔ تب عدل نے بڑے خوشگوار لہجے میں کندھے اچکا کر کہا۔

"کیا حرج ہے یہ اس کے باپ جیسے چچا کا گھر ہے۔۔۔ ویسے میں اس کی شادی کردوں گا۔ آخر یہ میری ذمہ داری ہے۔" اس نے بھی جواباً" انگلش میں وضاحت کی تھی۔

ماہمن کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے' اس کے اندر ابلتا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جبکہ جوئی بے چاری چپ چاپ سر جھکائے ہاتھوں کو گھور رہی تھی' اسے ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ پھر عدل ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ ناشتے کی ایک ایک چیز اٹھا کر اس کے سامنے رکھنے لگا تھا۔ اس کی پلیٹ بھرتا جا رہا تھا۔ خود اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ پیتا جوئی کی طرف متوجہ تھا۔

"یہ فرائی انڈا لو۔۔۔ پراٹھا کھاؤ۔۔۔ فرنچ ٹوسٹ اٹھا لو اور یہ دودھ کا گلاس بھی ختم کرنا ہے۔ شاباش! پلیٹ خالی کرو۔"

عدل ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ نرمی اور مٹھاس تھی' جوئی کا دل تو اس کی توجہ سے ہی بھر گیا تھا۔ پھر بھی جب عدل اتنی محبت سے اصرار کر رہا تھا تو وہ بھلا کیسے انکار کرتی؟ وہ اس کی طرف سے بے دلی نہ پا کر جام' مارملیڈ' نٹو' چکن سپریڈ اور جانے کیا کیا الم غلم رکھنے لگا تھا۔

"اتنی کمزور ہو' کھاتی پیتی کچھ نہیں۔۔۔ میں پھونک ماروں گا اور تم اڑ جاؤ گی۔ دیکھنا' دنوں میں تمہیں کیسا پہلوان بنا دیتا ہوں۔"

عدل نے اس کے لیے ابلا انڈا چھیلا تھا' پھر اس کے پیس بھی کیے فورک پلیٹ میں رکھا اور اسے ایک پیس خود کھا کر طریقہ سمجھانے لگا۔ عدل کا انداز کچھ ایسا تھا کہ جوئی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی' اس نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا جبکہ عدل اسے بغور دیکھنے لگا' وہ خود بھی مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ' بے تکلفی' نرمی' توجہ کو دیکھ کر ماہمن کی دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ جبکہ غفیرہ کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔

"عدل میری جان! اس کے معدے پہ ظلم مت ڈھاؤ! اسے ایسی خوراک کی عادت نہیں۔ بیمار پڑ جائے گی۔" غفیرہ کے لیے یہ منظر دیکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ عدل اسے دودھ کا گلاس زبردستی پکڑا رہا تھا۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ مالٹو کا چمچہ بھر کے مکس کرچکا تھا۔ بظاہر انہوں نے میٹھے لہجے میں کہا تھا مگر ماہمن جانتی تھی' کس طرح اندر سے سلگ رہی ہیں اور یہی حال ماہمن کا بھی تھا۔

"کھائے گی تو عادت بنے گی۔" وہ ان کی کسی بھی بات پہ دھیان نہیں دے رہا تھا۔

"دیکھ لو' تن' راحت' سکون' آرام اور آسائشات کا عادی ہو جائے تو غضب ڈھانے لگتا ہے۔ برا مت ماننا۔ اس کے بھلے کے واسطے کہہ رہی ہوں۔" غفیرہ نے کڑوی کافی حلق میں انڈیل کر پھر سے نرم ملائم لہجے میں زہر اگلا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اٹھا کر باہر پھینک آتیں۔ پھر جب عدل' جوئی کو ناشتہ اپنی نگرانی میں کرا کر شاور لینے واش روم میں چلا گیا تب جوئی کو کچن سے باہر نکلتے دیکھ کر ماہمن پلیٹ میں رکھے انڈے کے ٹکڑوں سے کھیلتی بہت نرم لہجے میں غفیرہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"مما! عدل بہت سوفٹ نیچر کا ہے۔ وہ تو اپنے پالتو کتے کے ساتھ بھی بہت نرم برتاؤ رکھتا ہے۔ اسے توجہ اور وقت دیتا ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی اس کی رغبت' توجہ' میلان' رجحان اور ہمدردی کو غلط معنوں میں لے۔"

وہ جو ساری زندگی کٹیلی' ترش' زہریلی باتیں سنتی آئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے سنتی رہ گئی۔

"ویل ویری گڈ۔۔۔" غفیرہ نے جوئی کے نکلتے ہی ماہمن کو خوش دلی کے ساتھ سراہا۔۔۔ "یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اس لڑکی کو اچھی طرح سے باور کروادو۔ عدل کی ہمدردی کو کسی اور رنگ میں مت دیکھے۔ ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔" وہ سکینہ کو آواز دیتی اٹھ گئی تھیں۔

آئندہ آنے والے دنوں میں عدل نے ثابت کر دیا تھا کہ جوئی اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ جوئی کو ایک دن اپنے ساتھ شاپنگ پر لے گیا۔ اسے رنگ رنگ کے ملبوسات لے دیے۔ اسے گھماتا پھراتا رہا۔ پھر پر گر کھلایا' اپنے تئیں وہ اس کے اندر سے بابا کے اچانک چلے جانے کا غم اکھاڑ رہا تھا۔ وہ اس کی شخصیت پہ چھایا جمود توڑنا چاہتا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا' جوئی کی سنجیدگی' کم گوئی' خاموشی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ کبھی ماہمن جیسی شوخ' چنچل' منہ پھٹ' ہنگامہ پرور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ عمر بھر خاموش اور سنجیدہ رہی تھی' اسے کبھی کسی نے بولنے نہیں دیا تھا۔ وہ صرف کام کرنے کی مشین تھی جو نہ بولتی تھی نہ کسی بات کا جواب دیتی بس اپنا کام کیے جاتی۔

ڈاکٹر چاچو کے گھر آکر اسے ایک بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ عدل کے علاوہ اس گھر میں کوئی اس کا خیر خواہ نہیں۔

وقت کچھ اور آگے کی طرف کھسکا تو جوئی کی سوچ نے خود بخود کروٹ لی تھی۔

ماہمن کا عدل پہ حق جتانا۔۔۔ اس کے ساتھ بے تکلفی' دوستی' جھگڑے' لڑائیاں۔۔۔ نوک جھونک اور اس تمام قصے میں امڈتی ابھرتی' واضح ہوتی محبت وہ لاکھ دل کو سمجھاتی پھر بھی اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ماہمن اور عدل کے درمیان کچھ خاص ضرور ہے۔ کیونکہ عدل کی غیر موجودگی میں ماہمن جتانے سے باز نہیں آتی تھی۔

"عدل مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔" وہ اسے اترا اترا کر بتاتی' پھر اس محبت کے بے شمار ثبوت دکھاتی۔

ایک روز وہ جوئی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے عدل اور اپنی بڑی بڑی تصویریں دکھائی تھیں۔ ہر تصویر میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ایک خاص محبت کے رشتے کو واضح کرتے۔

"اور کچھ مزید "خاص" بھی ہے' ابھی دکھاتی ہوں۔ پہلے یہ دیکھو۔" ماہمن نے اسے الماری کا پٹ کھول کر دکھایا۔ وہ الماری جیسے امپورٹڈ سامان کی پوری دوکان تھی۔ وہاں رنگ رنگ کے پرفیومز' جیولری' کپڑے' ساڑھیاں' چیسٹو کلاک' فراکس' ہیٹ' جیکٹس ترتیب سے رکھے تھے۔ وہاں ایک سلور باکس بھی تھا۔ ماہمن نے کھول کر دکھایا۔ اس باکس میں ہیرے کی دمکتی انگوٹھیاں' ہیئر پن' بریسلٹ' لونگیں' ایئر سٹڈ بڑے قیمتی موتیوں کی مالا اور نیکلس چمک دمک رہے تھے۔ پھر وہ اسے اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھے موسیقی کے آلات دکھانے لگی۔

"یہ سب عدل لایا ہے وقتاً" فوقتاً"۔۔۔ مجھے ایک زمانے میں شوق چڑھا تھا۔ پھر اتر بھی گیا۔ تاہم میں نے یہ سامان عدل کے ہزار دفعہ کہنے کے باوجود اسٹور میں نہیں پھنکوایا۔ مجھے عدل کی دلائی ایک ایک چیز سے بہت پیار ہے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ مجھے عدل سے عشق ہے۔"

وہ اس کی پتھرائی آنکھوں میں ایک ایک کانٹا چبھوتی بڑے سکون کے عالم میں کہہ رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بڑا سرور پن تھا۔ جیسے وہ اسے جتلا رہی تھی اپنی بے لگام ہوتی دھڑکنوں کو کنٹرول کرو اور عدل کے خواب کو نوچ ڈالو۔ وہ تمہیں اپنے پالتو جانوروں جیسی اہمیت دیتا ہے۔"

وہ آنکھوں سے نشتر چلاتی ماؤتھ آرگن بجانے لگی پھر پیانو کو چھیڑا۔۔۔ وہاں ایک ڈگڈگی بھی تھی۔ ماہمن نے باقاعدہ بجا کر دکھائی۔

"اسے ڈگڈگی کہتے ہیں۔ میں اس پہ انسانوں کو بھی

نچاسکتی ہوں۔ بچ کر رہنا۔" وہ ایک دم ہنسنے لگی تھی۔

"عدل نے سارے موسیقی کے آلات اکٹھے کر دیے۔ حالانکہ میں نے تو صرف ماؤتھ آرگن کی فرمائش کی تھی اور یہ تمام تحائف بھی عدل نے دیے' ہر ایک خوب صورت موقع پر اس کے لیے میں بہت خاص ہوں۔" ماہن الماری میں رکھی ایک ایک چیز کو اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے کر رہی تھی۔ جوئی کی آنکھیں جلنے لگیں' ان میں ریت چبھنے لگی' بکھرنے لگی۔ وہ ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔

"وہ رشتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور بابا سے منسلک رشتوں اور ان کے تعلق داروں سے تو بہت انسیت رکھتا ہے۔ یہ اس کی بہت اچھی عادت ہے مجھے عدل کی عادتوں پہ فخر ہے۔ وہ غریب رشتہ داروں کی مدد کرتا ہے بلکہ ان پر پیسہ لٹاتا ہے..... اور میں اسے نیکی کے کاموں سے روکتی بھی نہیں۔" ماہن بریسلٹ کو اپنی گوری کلائی میں گھماتی مسکرائی تھی۔ اس کے الفاظ سخت نہیں تھے' لہجہ بھی نرم تھا ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ پھر جوئی کو چبھ کیا رہا تھا۔ وہ اپنی پھوپھی جیسی تھی' نرم اور شیریں لہجے میں کاٹ دینے والی باتیں کرتی مسکرا مسکرا کر زہر اُنڈیلتی' پیار جتا کر آگ سلگاتی۔ عدل جب گھر میں ہوتا' جوئی کے ساتھ ہوتا' اس کو وقت دیتا' اس سے باتیں کرتا' تب وہ غیض سے بھر جاتی تھی۔ پھر جوئی کا جیسے جینا حرام ہو جاتا' اس پہ طنز کرتی غصہ کرتی' کچوکے لگاتی' اس کی غربت' جذباتی انداز پہ چوٹ کرتی۔

اور جب عدل نظر سے اوجھل ہوتا' جوئی کے قریب نہ ہوتا تب پھر سے بدل جاتی' نرم باتیں' نرم گفتگو اور اکثر پشیمان نظر آتی' معافی بھی مانگ لیتی۔

تب جوئی جیسی جاہل گنوار لڑکی نے ماہن کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اس کی ناقص عقل۔ اس کے اندر چھپے جذبوں کو کھوج آئی۔ جوئی نے جان لیا کہ ماہن کو عدل اور جوئی کا اکٹھے بیٹھنا۔ ہنسنا بولنا گوارا نہیں ہوتا۔

اگلے بہت سارے دنوں میں جوئی اور بھی بہت کچھ جان گئی۔ مگر اس سے بھی پہلے عدل نے کچھ اور انوکھا کر دیا۔ وہ جوئی کے لیے دسویں جماعت کی کتابیں اٹھا لایا۔ جوئی کی زندگی کا دوسرا بڑا خواب' وہ عدل سے ملنے کے بعد دوسری مرتبہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ حالانکہ تب غفیرو چاچی نے بہت ناگواری جتلائی تھی۔ اپنی عزت' وقار اور زبان کو سنبھال سنبھال کر بہت گہری چوٹ اور بڑے گہرے طنز کیے تھے۔

"بیٹے! یہ کہاں پڑھنے کے قابل ہے۔ بے چاری کو آتا جاتا تو کچھ نہیں۔ کیسے میٹرک کے امتحان کو پاس کر پائے گی۔ اپنی انرجی کیوں ویسٹ کر رہے ہو۔" وہ حتی المقدور کوشش کرتی رہی تھیں کہ کسی طریقے سے عدل اپنے ارادے سے باز آجائے۔ مگر وہ بھی تو ہلال کبیر کا بیٹا تھا۔ ایک دفعہ فیصلہ کر لیا تو بس کر لیا۔

"میں خود اسے ٹیوشن دوں گا اور ٹیوٹر کا بھی بندوبست کروں گا۔ یہ بہت انٹیلی جنٹ ہے مما! آپ کبھی اس سے بات کر کے دیکھیں تو سہی۔" وہ جانے کہاں کہاں سے جوئی کے اندر موجود خوبیوں کو ڈھونڈ لاتا تھا۔

"ہونہہ.....!" انہوں نے حقارت سے دوسری طرف منہ موڑ لیا تھا اور یہی حال ماہن کا تھا۔ وہ اکیلے میں عدل سے الجھ پڑی۔

"کیا ضرورت تھی' اسے اسکول بھیجنے کی' پرائیویٹ امیدوار کے طور پر دے لیتی۔ ویسے بھی اس نے فیل ہی تو ہونا ہے۔" ماہن نے جس غصے بھرے لہجے میں بات کا آغاز کیا تھا۔ عدل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"میں اسے پڑھاؤں گا تو کبھی فیل نہیں ہوگی۔ اسے ڈس ہارٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔" عدل نے پہلی مرتبہ ماہن سے سخت ترش لہجے میں بات کی تھی جس کی اسے ایک مرتبہ پھر بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کا بے ضرر وجود غفیرو چاچی اور ماہن کی نگاہ کا کانٹا بن چکا تھا مگر وہ کہاں جاتی؟ یہ واحد جائے پناہ تھی

اور پھر ماہن کی بگڑتی حالت نے اس کی زندگی کو کچھ اور تلخ بنا دیا تھا۔

عدل کے ساتھ جوئی کے معاملے اور جوئی کی ذات کے متعلق آخری تکرار کے بعد وہ شدید بیمار پڑ گئی تھی اور اس کی بیماری نے عدل کو سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ وہ اپنے کھردرے' سرد رویے پر پشیمان ہو گیا تھا۔ کیونکہ ماہن میعادی بخار کی زد میں آگئی تھی۔ اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ وہ دو ہفتے ایڈمٹ رہنے کے بعد گھر آئی تھی۔ بہت کمزور' بددل اور خاموش لگ رہی تھی۔ جیسے ہنسنا بھول گئی ہو۔ عدل خود کو اس کی حالت کا ذمہ دار ٹھہراتا' اپنی لاپروائی' بے توجہی کو کوستا۔ جب سے جوئی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ ماہن کو قطعاً" بھول گیا تھا۔

جب ماہن گھر آئی۔ تب عدل نے اس سے اپنے گزشتہ رویوں کی پر معذرت کی تھی۔ وہ حقیقتاً" نادم اور پشیمان تھا اور وہ اسے نادم دیکھ کر رونے لگی۔

"تم جانتے ہو' میں تمہاری بے اعتنائی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر بھی مجھے ہرٹ کرتے ہو۔ مجھے وقت نہیں دیتے۔ کاش تمہاری ٹریننگ جلد شروع ہو۔ تاکہ تم سارا وقت میرے ساتھ رہ سکو۔" وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ عدل کے دل میں اتر رہی تھی۔

"اب تم جزا کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ آخر تم اور مما سمجھتی کیوں نہیں۔ وہ لڑکی بابا کو بہت عزیز تھی۔ اس کا بابا کے علاوہ کوئی نہیں اور وہ بابا کو کھو دینے کے غم سے گزر رہی ہے..... میں اسے توجہ نہ دوں تو وہ مزید ٹوٹ جائے گی۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ کوئی غیر نہیں۔" عدل بہت نرم لہجے میں اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ محض اس کی کزن ہے۔ ماہن غلط گمان میں نہ پڑے اور دل میں موجود گانٹھ گرہ کو کھول دے۔

"ہونہہ..... تمہاری جزا میرے لیے سزا بن رہی ہے۔ میں رات دن ایک اذیت کا شکار ہوں۔" ماہن کے آنسو پھسلتے رہے' عدل کے دل پہ گرتے رہے۔

"اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں' مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے' بابا اسے میرے حوالے کر کے گئے ہیں۔" وہ اپنے جذبات لفظوں میں بتا نہیں سکتا تھا۔ حقیقتاً" وہ جوئی کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔

"تم اسے اپنا عادی بنا رہے ہو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ اسے بتاتے کیوں نہیں۔" ماہن تیز لہجے میں بولی تھی جیسے آج کوئی فیصلہ کر کے رہے گی۔

"کیا؟" عدل حیران ہوا۔

"میرے اور اپنے بارے میں۔" اس کا انداز لٹھ مار قسم کا تھا۔ عدل لب بھینچ کر رہ گیا۔

"حد ہے ماہن بچپنے کی۔ اب کیا میں اشتہار لگا دوں اخبار میں خبر لگواؤں؟ تب یقین کرو گی؟" وہ بری طرح زچ ہو گیا تھا۔ معاً" باہر کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ عدل نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازے کے پاس کوئی سایہ کھڑا تھا۔

"تم..... تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو عدل!" ماہن مچل کر بولی۔ آج بہت دنوں بعد وہ اپنا پسندیدہ سوال لبوں پہ سجائے بیٹھی تھی۔ عدل نے نرمی سے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"بے حد' بے شمار' بے حساب' بے پناہ اور جتنے بے رہ گئے ہیں۔ ان کو خود ساتھ لگا لو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اب آئے دن بیمار رہ کر میرا امتحان مت لیا کرو۔" عدل نے اس کے گالوں پہ پھسلتے آنسو پونچھ کر کہا تھا۔ ماہن لمحوں میں شانت ہو گئی تھی' اس کے سنہرے چہرے پہ سکون بکھر گیا تھا اور اسے مطمئن دیکھ کر عدل بھی پر سکون ہو گیا تھا۔

"اب تم آرام کرو۔ میں ذرا جم کا چکر لگا آؤں۔" وہ ماہن کی ناک کھینچتا باہر کی طرف آیا۔ تب اس نے دروازے کے پاس نظریں جھکائے کھڑی جوئی کو دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں سوپ کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔

"غفیرو چاچی نے دیا ہے۔ ماہن کے لیے۔" اس نے ہکلا کر وضاحت کی تھی۔ عدل نے غور نہیں کیا تھا' وہ جلدی میں تھا۔ ورنہ اس کی جھکی پلکوں پہ اٹکی شبنم کو

دیکھ لیتا۔ اس کے چہرے پہ پھیلے کرب کو کھوج لیتا۔ وہ کس اذیت اور درد سے گزر رہی تھی۔ اس کی تو زندگی روٹھ گئی تھی۔ اسے یوں لگا' وہ کھڑے کھڑے ڈھے جائے گی۔ بکھر جائے گی۔ اسے عدل کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اس کے یقین دلاتے لفظ' جو صرف ماہن کے لیے تھے۔ اس کا محبت کی آنچ دیتا لہجہ۔

تو ماہن ٹھیک کہتی تھی۔ عدل اس سے محبت کرتا تھا تو پھر جوئی کے لیے کیسے جذبات رکھتا تھا؟ ایک غریب کزن' یتیم کزن کے لیے محض ہمدردی' انسیت جو اس کی فطرت کا حصہ تھا' ہمدردی کرنا' خیال رکھنا۔ توجہ دینا عزت دینا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کپکپانے لگی۔ معاً" کھلے بیڈ روم سے ماہن کی غرور میں ڈوبی آواز آئی۔

"جوئی! کیا پتھر میں ڈھل گئی ہو' اندر آجاؤ۔" اس کے لہجے میں واضح مستی تھی' جیسے عدل کے منہ سے نکلا اظہار خاص طور پر جوئی کو سنوا کر اب اس کی حالت زار سے لطف اٹھا رہی تھی۔ تو گویا اس نے جوئی کی موجودگی محسوس کر کے جانتے بوجھتے ایسی صورت حال پیدا کی تھی۔ جوئی نے سنبھل کر پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا جسے لے کر ماہن نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ اب وہ اسے اشارے سے بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

"عدل مجھے بہت چاہتا ہے۔ تم نے سن لیا نا۔۔۔ مجھ سے محبت میں اور باقی لوگوں سے "انسیت" میں بہت فرق ہے۔"

وہ جیسے جوئی کو باور کروا رہی تھی وہ عدل کے لیے بہت اہم تھی۔ یہ تو جوئی اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھی' ماہن اور عدل کی بے تکلفی' ان کا ایک دوسرے کو سمجھنا' انڈر اسٹینڈنگ' اٹیچ منٹ' محبت' اظہار' سب واضح تھا۔ جوئی تو چاہ کر بھی عدل سے اتنی برجستہ گفتگو نہیں کر سکتی تھی' بے تکلفی نہیں دکھا سکتی تھی' وہ ماہن کی طرح اس کے کندھے جھنجھوڑنے' بال کھینچنے اسے کُکے' گھونسے مارنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کی پلیٹ میں سے کچھ بھی بغیر پوچھے یا پوچھ کر بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ عدل کی چائے' کافی' جوس' حتی کہ پانی تک کا گلاس پکڑ کر پینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ماہن کی طرح عدل کے لیے کانٹی نینٹل کھانے نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ نان' خطائی' بیسن کے لڈو' میٹھے کے حلوے' نمکین مٹھریاں' جلیبی' کھویا' موتی چور کے لڈو اور امرتی بنانے والی جھینگا پلاؤ' چکن بریانی' پمفلٹ' پڈنگ' کیک' کوکونٹ رائس' چائنیز سوپ' اسٹرابیری سوپ' چیز سینڈوچ' کریزنا' لزانیہ ٹائپ ڈشز کیسے بنا پاتی' اسے تو کافی بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ اور تب اسے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑی تھی جب ایک رات اسے انگلش کا ٹیسٹ یاد کرواتے عدل نے نرمی سے کہا تھا۔

"جزا! میرے لیے کافی تو بنا لاؤ۔۔۔ سکینہ تو اپنے کوارٹر چلی گئی اور ماہن نیٹ پہ بزی ہے۔" وہ کسی کتاب میں غرق اچانک بولا تھا۔

جوئی فوراً" سر ہلا کر کتاب رکھے اٹھ کر کچن میں چلی آئی تھی۔ اسے پتا تھا' چائے کافی کا سامان کہاں رکھا ہے۔ مگر اسے کافی بنانے کا نہیں پتا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ وہیں کھڑی رہی۔ سوچتی رہی' غور کرتی رہی۔

"جانے چاچی اور ماہن کیسے بناتی ہیں؟ پہلے قہوہ' پھر دودھ' پھر کافی پاؤڈر؟ اللہ جی! کیسے بناؤں؟" وہ انگلیاں مسلتی چولہے پہ پانی چڑھانے لگی تھی۔ پھر اس نے اپنی عقل کے مطابق پتی پانی میں انڈیل کر قہوہ بنایا' دودھ ڈالا' کافی پاؤڈر مکس کیا اور اپنے تئیں بڑا سا مگ کافی کا تیار کر کے ٹرے میں رکھے وہیں کھڑی سوچتی رہی۔

"جانے عدل کو پسند آئے گی یا نہیں۔" پہلی مرتبہ عدل نے کوئی فرمائش کی تھی۔ اگر اسے پسند ہی نہ آئی تو پھر اس سے آگے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اسے کھڑے کھڑے چکر آرہے تھے جب عدل خود ہی گھبرایا گھبرایا کچن میں آگیا۔

"جزا! تم ٹھیک تو ہو؟ اتنی دیر لگا دی؟ میں گھبرا گیا تھا۔" جب وہ پون گھنٹے تک بھی واپس نہ آئی تب وہ گھبرا گیا۔ جانے وہ برنر جلا پائی یا نہیں؟ خود کو جلا نہ لیا ہو۔ گیس کا والو نہ کھول لیا ہو؟ کئی طرح کے وسوسے لیے وہ کچن میں بھاگا بھاگا آیا تھا پھر جزا کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر

اس کی جان میں جان آئی تھی۔ تاہم وہ جس قدر سراسیمہ سی کھڑی تھی' عدل پھر سے متفکر ہو گیا۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں کھڑی ہو' ارے کافی بنالی 'لاؤ مجھے وہ شدید طلب تھی۔" اس نے مسکرا کر مگ پکڑ لیا۔ مگر پہلے ہی گھونٹ نے بے مزہ کر دیا تھا۔ اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔

"اس۔۔۔ یہ کیا بنایا ہے؟" وہ بری طرح حیران ہو کر مگ میں جھانکنے لگا تھا۔ مگ میں کالا سیاہ عجیب رنگت کا کوئی محلول تھا۔

"پسند نہیں آئی کیا؟" جوئی نے انگلیاں موڑتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آس سی لہرا رہی تھی۔ جیسے وہ ابھی بہت تعریف کرے گا۔ جیسے مامن کی بنائی ڈشز کی کرتا تھا۔ عدل کچھ بولتے بولتے رک سا گیا۔ وہ بری امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بہت اچھی بنائی ہے۔ بہت الگ' منفرد اور مزے دار سا ٹیسٹ آ رہا ہے۔ افریقی برانڈڈ کافی ہے۔ بہت اعلا' بہت لاجواب۔ مجھے بھی ریسپی بتانا' میں بھی کبھی اکیلا ہوا تو ٹرائی کروں گا۔ بہت عمدہ خوشبو اور بہترین ذائقہ ہے۔ میں ایک مگ اور بھی پینا چاہوں گا۔ جزا! تم لاجواب کافی بناتی ہو۔" اس نے کھڑے کھڑے تعریفوں کے عظیم پل کھڑے کر دیے تھے اور دیکھتے دیکھتے جوئی کا چہرہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس کی اتنی عمدہ تعریف کی تھی۔ حالانکہ یہ تو معمولی سی کافی تھی۔ وہ تو چالیس چالیس کلو کھویا اور بوندی کے لڈو تیار کرتی تھی۔ انتہائی لذیذ' خستہ' عمدہ ترین' مگر کسی نے کبھی جھوٹے منہ تعریف نہیں کی تھی۔ اور یہاں عدل نے ایک مگ میں موجود قہوے دودھ اور پاؤڈر کے محلول کی اتنی تعریف کر ڈالی تھی۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔

"کیا میں ایک اور مگ بنا دوں؟"

اس نے سرخوشی کے عالم میں کہا تھا۔ یہ عدل کا بخشا ہوا اعتماد تھا جو وہ اس کے سامنے کچھ کچھ بولنے لگی تھی۔ اسے دوبارہ کوکنگ رینج کی طرف بڑھتے دیکھ کر عدل بوکھلا گیا تھا۔ کافی کی چسکیاں حلق سے بمشکل اتارتے ہوئے وہ جلدی سے بولا تھا۔

"آں۔۔۔ ہاں نہیں جزا! آج کے لیے اتنا ہی۔۔۔ پھر کبھی ایسی ڈوز لینے کے لیے تمہیں زحمت دوں گا۔ ابھی تم اپنا ٹیسٹ یاد کرو' ویسے بہت سارا شکریہ' تم نے کافی بنائی سویٹ کزن!" اس نے خود پر مزید ظلم ڈھاتے ہوئے آدھا مگ کھڑے کھڑے پی لیا تھا۔ تاہم وہ جوئی کی خوشی کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے غیر ارادی طور پر پوچھنے لگا۔

"تم کوکنگ میں تمہیں اور کیا بنانا آتا ہے؟" وہ جو گندے برتن سنک میں رکھے دھونے لگی تھی' اس کے سوال پر گردن موڑتے ہوئے بڑے جوش سے بولی۔

"مجھے بوندی کے لڈو بہت اچھے بنانے آتے ہیں۔۔۔ میں چالیس چالیس کلو' آرڈر پہ بناتی تھی۔" اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ جیسے وہ اپنی اس صلاحیت پر بہت نازاں تھی۔ عدل چالیس کلو کا سن کر حیران رہ گیا۔

"تم بیکری کا کام کرتی تھیں۔" اس نے متعجب ہو کر پوچھا تھا۔ اسے جیسے دھچکا لگا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں تو' میرے ماموں کا اپنا کاروبار تھا۔ لڈو اور کھویا بناتے تھے۔ میں نے نانی سے سیکھا۔" جوئی نے ہکلا کر وضاحت کی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ عدل کو برا لگا ہے۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

"تمہارے ماموں تو فوت ہو چکے اور نانی بھی۔ پھر کاروبار کون چلاتا تھا؟" وہ خاصا برہم لگ رہا تھا۔

"ماموں کا بیٹا۔" اس نے مری مری آواز میں بتایا تھا۔ جانے عدل کو کیا برا لگا تھا۔

"تو کیا کاریگر رکھے ہوئے تھے؟ یا پھر تم ہی۔" وہ کچھ سوچ کر بولا تھا' پھر اس نے مگ سنک میں لڑھکا دیا۔ وہ بدمزا سی زہر بھری کافی تقریباً" پی چکا تھا۔ جوئی جیسے نہال ہی ہو گئی۔ مگ جو خالی تھا۔

"میں کام کرتی تھی۔ کاریگر تو بہت بعد میں

آئے۔" اس نے مگ دھو کر ریک میں سجا دیا تھا پھر دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھنے لگی تھی۔

عدل کچھ سوچتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ پھر اس نے جوئی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر باریکی سے جائزہ لیا۔ اب وہ اس کے بازو دیکھ رہا تھا۔ آستین ہٹا کر۔ اسے کہیں کہیں مدہم پڑتے دھبے دکھائی دیے۔ ہاتھوں اور بازوؤں پر نشان تھے۔ جگہ جگہ سے جلد اکھڑی ہوئی سرخ تھی۔ کئی زخم بھر گئے تھے اور کچھ پہ کھرنڈ جما ہوا تھا۔

"یہ جلنے کے نشان ہیں نا؟ آئل یا گھی سے؟" وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔ جوئی حیران حیران سی سر ہلانے لگی۔

"ذلیل کا بچہ' تم سے کام کرواتا تھا۔ تب ہی جب بھی بابا تمہارا ذکر کرتے تھے صرف ایک ہی بات دہراتے۔ جوئی برے حالوں میں ہے۔ جب تم آئی تھیں تب بھی تمہارے ہاتھ پہ نشان تھے۔ جانے لوگ اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے۔ یتیموں کو ستاتے ہیں۔ وہ تمہارے رشتے دار تھے یا جانور؟ مجھے تو آج تک حیرانی ہے۔ آخر بابا نے تمہیں ان درندوں کے پاس کیوں چھوڑا؟ یہاں کیوں نہیں لائے؟ تمہیں اچھا ماحول ملتا' اچھی اسکولنگ ہوتی' بہترین خوراک ملتی۔ تب تم کسی اور جزا کے روپ میں ہوتیں۔ خیر میں اب بھی تمہیں ویسی جزا بنا دوں گا۔"

عدل بہت ملائمت' نرمی اور محبت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی جیسے ہلکی سی اوس گری ہو۔ بابا کی یاد میں یا پھر جوئی کی تکلیف کے احساس سے۔

"میں آپ کو بوندی کے لڈو بنا کر کھلاؤں گی۔ آپ نے ایسے لڈو عمر بھر نہ کھائے ہوں گے۔" وہ اسے تکلیف کے احساس سے باہر نکال لائی تھی۔ تب وہ چونک کر سر ہلانے لگا۔

"اس کافی جیسے مزے دار؟" وہ سہم گیا تھا۔ اور ہنسنے لگا۔ پھر اس کے سر پہ چپت لگا کر بولا۔ "ہاں ضرور میں وہ لڈو کھاؤں گا اور جو بچ گئے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے اور موی کے ٹریننگ آرڈر آنے والے ہیں۔" پھر وہ اسے ٹیسٹ کے متعلق تاکید کر کے مڑ گیا۔ جبکہ جوئی پتھر میں ڈھلی مورت بن گئی تھی۔

"عدل جانے والا تھا' کہاں' کدھر' اسے تنہا چھوڑ کر۔" اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔۔۔ وہ چکر کھا کر گر ہی پڑتی اگر غفیو چاچی کی آواز اسے زہریلی سوچوں کے بھنور سے نکال نہ لاتی۔ وہ جانے کب سے باہر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھیں اور اب بہت گہری کاٹ دار نظروں سے اسے چھیدتی بظاہر ملائمت سے بولیں۔

"بوندی کے لڈو ضرور بنانا' مگر عدل کی شادی پہ مہندی کی رسم کے لیے تیار کرنا۔ آخر حلوائی کزن کا کوئی تو فائدہ ہو۔" وہ تیکھے لہجے میں کہتی بہت سرد آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اور ہاں۔۔۔ عدل سے دور ہی رہا کرو۔ ورنہ جلد ہی کوئی اور بندوبست کر دوں گی۔ اس کے ساتھ چپکنے کی ضرورت نہیں' وہ تمہیں منہ لگا رہا ہے۔ اپنے باپ کی وجہ سے۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔" وہ اسے پتھر کا بت بنا کر باہر نکل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے لیے وقت پھر سرل کا درخت بن گیا۔ اونچا' لمبا' سیدھا اور طویل۔۔۔ جس پہ چڑھنا نہایت مشکل تھا اور وہ چڑھتے ہوئے' وقت کو برتتے ہوئے ہانپ ہانپ جا رہی تھی۔

غفیو اور مامن نے اس کے لیے خاموش محاذ کھڑا کر لیا تھا۔ یہ خاموشی تب ٹوٹ جاتی جب عدل نظر سے اوجھل ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کے سامنے بھی وہ کچوکے لگانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ مامن تو پھر بھی لحاظ کر جاتی تھی۔ مروت برت جاتی تھی۔ مگر غفیو دو دھاری تلوار تھیں۔ کبھی شہد بن جاتیں' کبھی زہر' اور انہیں جوئی کی ذات کو پیروں تلے کچل کر ذرا بھر نہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی' نہ شرمساری' نہ ندامت اور اب تو وہ جوئی کو اس کی ماں کے حوالے سے بھی طعنے

www.paksociety.com

دیتی تھیں۔

"تمہاری ماں والا جادو اب نہیں چلے گا۔ اس نے بھی کئی سال میرے شوہر کو اپنے دام میں پھنسائے رکھا۔ میں اپنے بیٹے کو تمہارے جال میں پھنسنے نہیں دوں گی۔"

وہ خون خوار نظروں سے اسے گھورتی تھیں اور جوئی سہم کر کسی کونے میں گھس جاتی۔ حرف شکایت تو اس کی زبان پہ کبھی آتا ہی نہیں تھا اور اس کی اتنی جرات بھی نہیں تھی جو وہ عدل کو غفیرو کے بارے میں جتا سکتی۔ پھر اگر جتا بھی دیتی تو کیا خبر عدل ماں سے بدگمان ہو جاتا اور غفیرو چاچی اس کا سانس لینا بھی محال کر دیتیں۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا بس یہیں ہے۔ اس کی عزت محفوظ تھی۔ بس اس کے قناعت پسند دل کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

اور اس کا سمندر جیسا وسیع دل تو عدل اور مامن کی محبت جان کر بھی قانع ہو گیا تھا۔ اسے عدل سے محبت تھی، عدل کو مامن سے محبت تھی اور جوئی کو عدل کی محبت سے محبت تھی۔

اس نے اب تک کی مختصر زندگی میں ایک کام بڑی دل جمعی سے کیا تھا۔ ایثار اور صبر، لیکن کبھی کبھی صبر کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جاتیں، غفیرو چاچی اور مامن اکثر اس کے صبر کو پل صراط سے گزارتی تھیں۔

پھر ایک روز مامن زبردستی اسے — اوپر والی منزل پہ لے آئی۔ آج پھر اس نے جوئی کو کچھ خاص دکھانا تھا۔ گول سیڑھیاں چڑھ کر مامن اسے کارنر والے ایک کمرے تک لے آئی۔ آبنوسی دروازے والا یہ کمرہ لوکیشن کے لحاظ سے بہت پرفیکٹ تھا۔ اس کے سامنے بالکونی تھی۔ جولان کے اس حصے کی طرف کھلتی تھی جس طرف صرف گلاب ہی گلاب بہار دکھاتے تھے، اوپر سے یوں دیکھنے والی نگاہ کو مبہوت کرتے کہ بندہ بس سحر زدہ رہ جائے۔

یہ کمرہ سفید فرنیچر سے سجا تھا۔ نیا نکور دمکتا فرنیچر، چمک ایسی کہ آنکھیں چندھیانے لگیں۔ سفید صوفہ، سفید کارپٹ، سفید پردے اور سفید پینٹ، جوئی جیسے مبہوت رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر چاچو کے گھر کا یہ کمرہ تو کمال کے آرٹسٹک ذہن کا شاہکار لگتا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ دیواروں پہ سفید ہی فریم میں بے شمار تصویریں سجی تھیں۔ عدل اور مامن کی بچپن سے لے کر اب تک، پالنے سے لے کر جوانی تک، جوئی دیوانہ وار دیکھتی رہی۔

"تم بہت حیران رہ گئیں نا؟" مامن نے مسکرا کر بڑے یقین سے پوچھا۔ "اتنی تمہاری عمر نہیں، جتنے سال سے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔" وہ بے خیالی میں چلتی ہوئی کارنس — پہ رکھی تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ عدل اور وہ دو اکرمیں تھے۔ دونوں منہ پھاڑ کر روتے ہوئے، کتنے خوب صورت پل مما نے کیمرے میں محفوظ کیے تھے۔

"میں نے عدل کا خواب تب دیکھنا شروع کیا، جب مجھے خوابوں کی خبر تک نہیں تھی۔" وہ خواب آگیں لہجے میں بول رہی تھی۔ گم صم سی بے دھیان سی، جوئی کا روم روم سماعت بنا ہوا تھا اور اس کے لفظ اسے پتھر کر رہے تھے۔

"تب میں بہت چھوٹی تھی، گیارہ یا بارہ سال کی۔" مامن کی آنکھ میں کوئی سنہرا پل لہرایا اور جوئی کے اندر کوئی زور — سے کرلایا۔

"کیا مجھ سے بھی چھوٹی؟ میں نے تو تب اسے دل میں بسایا جب دل کو دھڑکن کا اور دھڑکن کو دل کا کچھ پتا نہیں تھا۔" جوئی کا سر جھک گیا، مامن کا رتبہ، اس کی حیثیت، عدل سے اس کی محبت سب بہت بلند اور بھاری تھی۔ جوئی کی ذات ہیچ تھی، حقیر تھی۔ اسے جھکنا ہی تھا۔ سرنگوں ہونا ہی تھا۔ سو وہ جھک گئی تھی۔

"میں نے عدل کو بہت چاہا۔" اب وہ بڑے غرور سے بتا رہی تھی۔

"کیا مجھ سے بھی زیادہ؟" جوئی کا دل رو پڑا۔

"میں عدل پہ کچھ بھی قربان کر سکتی ہوں۔" مامن اپنی محبت کی انتہا بتا رہی تھی۔ اپنی شدتوں کا احوال سنا رہی تھی۔

"مجھ سے زیادہ؟ میں نے تو اپنا دل قربان کر دیا۔ کیا

تم اپنا دل قربان کر سکتی ہو؟" وہ سراپا کرب بنی کھڑی تھی، سراپا درد بنی کھڑی تھی۔

"عدل کے معاملے میں میرا دل بہت تنگ ہے۔ میں اسے کسی کے ساتھ دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی۔" مامن جیسے بے بس ہو کر بول اٹھی تھی۔ پھر اس نے تصویر دیوار پہ سجا دی۔

"اور عدل کے معاملے میں میرا دل بہت وسیع ہے۔ میں اسے تمہارے ساتھ دیکھ کر برداشت کرتی ہوں اور صبر کرتی ہوں۔" اس نے سر جھکائے اپنے لرزیدہ پیروں کو دیکھا، نم ہتھیلیوں کو دیکھا۔ کپکپاتے، کمزور نیلی ابھری رگوں والے ہاتھوں کو دیکھا۔

"جانتی ہو، یہ کمرہ کس کے لیے سجایا گیا ہے؟" اب وہ بہت فرصت کے عالم میں جوئی کے چہرے پر پھیلے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ اس کی لرزتی پلکیں، نیلا پڑتا چہرہ، کپکپاتا وجود۔۔۔ پھر بھی اس کا دل مٹھی میں بھینچنے سے باز نہ آئی۔

"یہ شادی کے بعد میرا اور عدل کا کمرہ ہو گا۔ مما نے پہلے ہی تیار کروا دیا۔ اس کی دیکھ بھال تمہارے ذمے۔۔۔ سکینہ پہ مجھے بھروسا نہیں۔ تم اس کمرے کا خیال رکھو گی نا؟" اب وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ جوئی کو اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ پھر یہ عدل کا تھا، کبھی تو کمرہ تھا۔ وہ کیسے انکار کرتی؟

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ موم سے بنی، جیسے چاہو سانچے میں ڈھال لو۔" جانے اب کیا ہوا تھا جو مامن اس کی تعریفوں پہ اتر آئی تھی۔ دراصل مامن ایسی ہی تھی۔ جوئی کو لگتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اس کا دل نہیں دکھاتی۔ بس عدل کی وجہ سے بے بس ہو کر دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔

مامن سے بمشکل اجازت لے کر وہ نیچے آئی تھی۔ پھر اپنا اسکول بیگ اٹھانے لاؤنج میں آئی۔ ابھی اس نے یونیفارم بھی نہیں اتارا تھا کہ اسے سٹنگ روم سے بولنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ چاچی اور یامن کی آوازیں تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پہ رک گئی۔

"مما! یہ کیا ڈراما ہے؟ عدل کو آخر کیا ہوا ہے؟ اس لڑکی کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ اوپر سے اس کی خاطر گھن چکر بنا ہوا ہے۔" یامن بہت بھری بیٹھی تھی۔ درحقیقت مامن کی بکھری بکھری شکستہ حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ بہت کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ چپ رہنے پر مجبور تھی۔ عدل کی پیشانی کے بل اسے خاموش کروا رہے تھے۔ وہ جوئی کے معاملے میں کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ اس صورت حال میں یامن کی پوری ہمدردیاں اپنی بہن کے ساتھ تھیں۔

"آپ اس معاملے کو لٹکا کیوں رہی ہیں؟ بابا کا چالیسواں بھی ہو گیا۔ آپ عدل سے بات تو کریں۔ شادی نہ سہی، نکاح کے لیے ہی اسے راضی کریں۔ مامن کی حالت آپ دیکھ رہی ہیں۔" یامن جذباتی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ بہت جلد عدل اور موی کی شادی کا فنکشن رکھوں گی۔ بس تھوڑا سا انتظار کرلو۔" انہوں نے سٹنگ روم کے دروازے پر کسی کی موجودگی محسوس کر کے آواز کچھ اور بلند کر لی تھی۔ انہیں یقین تھا باہر جزا کھڑی ہے۔ دونوں شادی کے معاملات ڈسکس کرنے لگی تھیں، جبکہ جوئی لرزیدہ قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے انگ انگ میں تھکن اتر آئی۔ دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔

"اور یہ تو طے ہے کہ تم میرے نصیب میں کہیں نہیں۔" اس نے آنکھیں میچ کر بہت سے آنسو اندر اتارے۔ "پھر بھی میرے دل کے سکون، خوشی اور راحت کے لیے تمہارا سامنے ہونا، تمہاری ذرا سی توجہ اور محبت ہی کافی ہے۔" جوئی نے داہنے بازو سے بندھی تھیلی کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا، اس کا دل جیسے چین کے احساس سے بھر گیا تھا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی قناعت تھی؟

"میں تم سے، تمہاری محبت سے، تمہاری خوشی سے جلوں گی؟ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم میرے ہو یا نہ ہو، میری ہر دعا تمہارے لیے ہے۔" اس کی آنکھوں میں عدل کا سراپا چھم سے اتر آیا۔

"محبت حسد کرنے، چھین لینے، بددعا دینے کا نام نہیں۔ محبت تنگ دلی کا نام نہیں، محبت کسی اندھے جنونی جذبے کا نام نہیں، محبت انتہا نہیں، محبت بقا ہے، محبت وفا ہے، محبت ایثار ہے، محبت دل کو بوند نہیں، بحر کرتی ہے، تمہاری عدل سے محبت اور میری عدل سے محبت میں بہت فرق ہے مامن! زمین اور آسمان جتنا فرق، تم اس فرق کی عمر بھر بھی پیمائش نہ کر سکو گی۔ تم میری طرح عدل کو کبھی نہ چاہ سکو گی۔" اس کی آنکھ میں مامن کا تصور بھی اتر آیا۔

"عدل کو تم سے محبت ہے، تمہیں عدل سے محبت ہے اور مجھے تم دونوں سے محبت ہے۔ میری محبت کی معراج کو تم دونوں نہ پہنچ پاؤ گے۔"

اس نے آنکھ سے گرتے سارے آنسو پونچھ لیے۔ وہ عدل اور مامن کی خوشیوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی راہ میں اپنے آنسوؤں کی ایک بوند بھی گرانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کے صبر کی ابتدا اور محبت کی انتہا تھی۔

☼ ☼ ☼

دن پر دن الٹتے گئے، تاریخیں بدلتی رہیں، مہینے گزرتے رہے، عدل اور مامن کی ٹریننگ ختم ہوئی۔ بیچ میں کچھ دن کا ریسٹ آیا اور مسافروں نے سفر کے لیے سامان باندھ لیے۔ ان دونوں کی پہلی پوسٹنگ اردن میں ہوئی۔ نیا سفر تھا، نئی من چاہی منزل تھی۔ دونوں بے انتہا پرجوش اور خوش تھے اور ان دونوں کو خوش دیکھ دیکھ کر جوئی کا دل سجدۂ شکر بجالاتا تھا۔ عدل، مامن کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا، جوئی عدل کو دیکھ کر مسرور رہتی تھی۔ ان دونوں کی خوشی اور سلامتی عمر بھر کے لیے جزا کبیر کی دعا بن گئی۔

یہ اس کی دعا کی تپش اور محبت کی گرماہٹ تھی جو عدل کے دل تک ہر گزرتے دن کے ساتھ خود بخود پہنچتی رہتی۔ اس کا دل جوئی کی طرف کھنچتا، لپکتا، مائل ہوتا اور وہ جیسے بے بس ہو جاتا۔ ہاں، تب وہ یہ سمجھتا تھا کہ جوئی کو اپنے پیچھے تنہا چھوڑ کر جانے کے احساس سے اس کا دل بے چین ہے۔ شاید مما اور یامن کے رویے کی وجہ سے۔ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں؟ اگر بابا ہوتے تو اسے جوئی کی فکر نہ ہوتی۔ مگر اب اس کا دل بہت بے چین تھا اور اس کی بے چینیوں کا رخ بدلنے کے لیے غفیرو نے شادی کا ہنگامہ جگالیا۔ بہت شارٹ نوٹس پہ شادی تھی۔ محض دس دن کے اندر اندر۔۔۔ غفیرو نے عدل کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر منالیا۔ حالانکہ ابھی ایک سال تک اس کا شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر غفیرو کے آنسوؤں سے پسیج گیا۔

پھر شادی کے فنکشن شروع ہوئے۔ مہندی، برات، ولیمہ، ایک سے بڑھ کر ایک فنکشن تھا۔ بہت ہی شان دار، بہت دھوم دھام نظر آئی۔ عدل اور مامن کے مشترکہ دوستوں نے محفل کے رنگ بڑھا دیے تھے۔ ولید، نمل، اسجد، وقاص۔۔۔ ان سب نے ادھر ہی ڈیرا لگائے رکھا تھا۔ گھر پہ چھایا جمود جیسے ٹوٹ گیا۔ اب قہقہے، ہنسی، ڈھولک کی تھاپ سنائی دیتی تھی۔ ان کے دوست بہت ہنگامہ پرور تھے، گھر میں اودھم مچائے رکھتے۔

اور اسی ہنگامے میں عدل کا دوست ولید موتی چور کے لڈو بنانی جزا کا اسیر ہو گیا۔ وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اپنے کام میں مگن، دھیما دھیما ہنستی، بہت سادہ اور معصوم سی لڑکی۔ اس کے بنائے لڈوؤں کی جیسے دھوم مچ گئی۔ عدل کے دوست اس کے گرویدہ ہو گئے۔

"ہم تو لڈوؤں پہ مر مٹ گئے۔" یہ ولید تھا۔ چوری چوری جوئی کو آتے جاتے دیکھتا ہوا۔

"لڈوؤں پہ یا پھر؟" نمل اس کی چوری پکڑ لیتی۔

تاہم ولید اپنی پسندیدگی عدل تک نہ پہنچا پایا۔ وہ عدل کا بیچ فیلو تھا اور مامن، عدل کے ساتھ ہی اردن جانے والا تھا۔ وہ تو نم نم آنکھوں کو جھپکتی دل پہ جانے کیسے بھاری بوجھ لیے چلتی پھرتی، اس اداس لڑکی تک بھی اپنی پسندیدگی پہنچا نہیں پایا تھا اور شادی کے فنکشن خیریت سے انجام کو پہنچ گئے۔ زندگی معمول پہ آ گئی۔ جزا کبیر ایک بڑے بھونچال سے بڑے ہی صبر اور

حوصلے کے ساتھ گزر گئی۔

مگر اس سے پہلے کیا ہوا؟

عدل کی مہندی والی رات؟

جب خلقت پہ نیند چھا چکی تھی۔ جب رات نے سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ جب وہ چھوٹی سی پہاڑی لڑکی ایک تاریک گوشے میں دبکی اپنے داہنے بازو سے بندھی تھیلی کو کھول کر اس خستہ سے پیلے کاغذ کو دیکھ دیکھ کر اپنے دل کو شانت کر رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور کوئی چپکے سے اندر داخل ہوا۔ جزا اچانک گھبرا گئی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر خستہ سے اس پیلے کاغذ کو سینے سے لگا کر اپنے تئیں چھپانے کی اور آنے والی ہستی کی نظر سے اوجھل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ غفیرو نے نہ صرف وہ پیلا خستہ کاغذ دیکھ لیا، بلکہ جھپٹ بھی لیا۔ ان کے تیور بڑے بھیانک اور خطرناک ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے جیسے شعلے لپکنے لگے۔

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" ان کا چہرہ خون رنگ ہو گیا۔ جبکہ جوئی کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ ان کے غیض پہ تھر تھر کانپنے لگی۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے غفیرو کو اور طیش دلا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کی آہنی گرفت میں اس کا چہرہ دبوچ کر جھٹکا دیا۔

"بولو، یہ کہاں سے آیا؟ کس نے تمہیں دیا؟" ان پہ طیش چڑھتا جا رہا تھا۔

"میری نانی نے۔" اس نے بمشکل ہکلا کر بتایا۔ اس کی آنکھ جھک گئی، سر بھی جھک گیا۔

"اوہ۔ تو ثبوت لیے پھرتی ہو۔۔۔ مکار بڑھیا سارے سبق پڑھا کر مری۔" انہوں نے غیض بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس خستہ کاغذ کے کئی پرزے کر دیے تھے۔ جوئی کا دل جیسے پرزہ پرزہ ہو گیا۔ وہ غفیرو کے قدموں میں جا گری۔

"رب کا واسطہ چاچی، ایسا نہ کریں۔" وہ فرش پہ گرے ٹکڑے اٹھانے لگی۔ "یہ کیا ظلم کیا چاچی! یہ کیسا غضب کیا چاچی!" ننھے کاغذ کے پرزوں کو چومنے لگی۔ اپنی اوڑھنی میں اکٹھا کرنے لگی، جبکہ غفیرو اب پرسکون کھڑی اس کی بے قراری دیکھ رہی تھیں۔ ان کا طیش اتر چکا تھا۔ جیسے وہ ایک اور قصہ تمام کر چکی تھیں۔

"عدل کو دکھانے کے لیے ثبوت رکھا ہوا تھا۔ بہت چالاک اور میسنی ہو تم۔" ان کا زہریلا لہجہ جوئی کو زہر زہر کر گیا۔

"عدل کو دکھانا ہوتا تو کب کا دکھا چکی ہوتی۔ آپ مجھے خود غرض سمجھتی ہیں چاچی! میری آپ کے بیٹے سے محبت ایسی خود غرض نہیں جو اسے کاغذ کا یہ ٹکڑا دکھا کر آزمائش کے پل صراط سے گزارتی۔ میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ مگر آپ نے میری زندگی کا کل سرمایہ لٹا دیا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ زمین پر بے حال بیٹھی تھی اور اس کے لفظوں نے غفیرو کو پتھر کر دیا تھا۔

"میری آپ کے بیٹے سے محبت ایسی نہیں، جو اسے آزمائش کے پل صراط سے گزارتی۔" جوئی کے الفاظ ان کے منہ پر طمانچے کی طرح پڑ رہے تھے۔ ان کے دل پر عجیب سا بوجھ لد گیا۔

"آپ کا بیٹا آسمان کا چاند ہے چاچی! اور چاند کا سنگی مامن جیسا روشن ستارہ ہو سکتا ہے۔ میں بھلا عدل جیسے چمکتے آسمان کے چاند کو زمین پر اترنے اور اپنے برابر کھڑا کرنے پہ کیسے مجبور کرتی؟ میں عدل کی مامن کے ساتھ محبت کو کیسے امتحان میں ڈالتی؟ میں عدل اور مامن کے درمیان کیسے آجاتی؟ میں ان پڑھ، غریب، کم عقل، نادان اور اجڈ ضرور ہوں۔ پر میں خائن نہیں، حاسد نہیں، میری ایسی اوقات کہاں تھی جو عدل کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ میں تو صرف اس کے لیے دعا کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔" اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے۔

"بہت۔۔۔ بولنا آگیا ہے تمہیں۔" غفیرو چاہ کر بھی لہجے میں جلال نہ بھر سکیں۔ جوئی کے الفاظ نے انہیں بری طرح کوڑے مارے تھے۔ وہ جیسے اندر سے بری طرح شرمسار تھیں۔

"مجھ جیسی کمزور لڑکی سے کیسا خوف ہے غفیو چاچی آپ کو؟" وہ اپنا کرچی کرچی وجود سمیٹتے بمشکل اٹھ پائی تھی۔ غفیو جو اسے منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں۔ بالکل گنگ ہو کر رہ گئیں۔ وہ اسے برا بھلا کہنا چاہتی تھیں۔ مگر اس کے برعکس ان کے منہ سے عجیب الفاظ نکلے۔

"میں ماہن کو دکھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔" وہ خود بھی حیران رہ گئیں۔ وہ اس لڑکی سے کیسی باتیں کرنے لگی تھیں۔ یہ دو ٹکے کی لڑکی اور وہ اس لڑکی کے سامنے اپنے محسوسات بیان کر رہی تھیں۔ انہیں جیسے خود پہ بھی تاؤ آگیا۔ درپردہ جیسے انہوں نے ثابت کر دیا تھا۔ کہ اگر جوئی' عدل کے سامنے کچھ سچ اٹھا لاتی تو ماہن کے دل کو دھچکا پہنچنا تھا' سو جوئی کا یہ احسان تھا جو اس نے عدل کو کچھ بتایا نہیں تھا۔

"آپ۔" "کیوں سمجھتی ہیں کہ میں ماہن کے دکھ کا باعث بنتی؟ اگر ماہن کو دکھ دیتی تو عدل کے دل کو ٹھیس پہنچتی۔ میں بھلا ایسا کس طرح کر سکتی ہوں۔" اس کی آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ یوں کہ غفیو بمشکل سن پائی تھیں۔ پھر ان سے وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ وہ جیسے جوئی کے احسان کے بوجھ تلے دب گئی تھیں۔ ان کے پیر من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ سر جھکائے پلٹ گئیں۔ جوئی کو نہ گالی دے سکیں' نہ جھاڑ سکیں نہ غصہ کر سکیں۔ جیسے جوئی کے الفاظ نے ان کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کروا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر وقت تھوڑا اور آگے کو کھسک گیا۔ عدل اور ماہن کے اردن جانے کی تاریخ آگئی۔ وہ جانتی تھی۔ عدل کے چلے جانے کے بعد پھر کوئی موسم بہار اس کے دل کی سرزمین پہ نہ اترے گا۔

ادھر عدل کو جوئی کی فکریں کھا رہی تھیں۔ وہ اسے پڑھنے' اپنا خیال رکھنے کی تاکیدیں کرتا رہا تھا۔ اس شب عدل نے جزا سے بہت سی باتیں کیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہا تھا۔ وہ اس سے عہد لے رہا تھا کہ اسے خوب پڑھنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے۔ عدل اسے پراعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ بہت کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ عدل نے اسے بتایا تھا۔ وہ جوئی سے بہت پیار کرتا ہے اور یہ کہ جوئی کبھی بھی خود کو تنہا نہ سمجھے۔ عدل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ وہ جب بھی پکارے گی۔ عدل کو موجود پائے گی۔ عدل نے اس سے کہا۔

"میری زندگی کے تین اصول ہیں جزا! ایک اگر میں غلطی کروں تو اس شخص سے ضرور معافی مانگ لیتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں دوسرا میں اسے کبھی نہیں چھوڑتا جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے چاہتا ہے اور تیسرا میں اس شخص سے کچھ نہیں چھپاتا جو مجھ پہ اعتبار کرتا ہے۔ انہیں یاد رکھنا۔ بابا کے بعد میں تم کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اور یاد رکھنا۔ زندگی میں جب بھی کبھی کوئی نیا موڑ آئے' مجھے ضرور بتانا۔" عدل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔ اس کے ہونٹوں پہ بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں بڑی پیاری چمک تھی۔

یہی چمک ماہن کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔ عدل سے شادی کے بعد وہ کسی فاتح شہزادی کی طرح جوئی کو آتے جاتے نخوت سے دیکھتی تھی۔ شادی کے بعد اس کی شخصیت میں اتراہٹ کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اس کے نخرے بھی بڑھ گئے تھے۔

حالانکہ یہاں ہار جیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ماہن اسے شکست سے دوچار کرنے کے زعم میں تھی' جبکہ جوئی نے یہ جنگ بنا لڑے ہی انجام تک پہنچا دی تھی۔ ماہن کی چھوٹی سوچ اس چھوٹی سی پہاڑی لڑکی کے دل کی وسعت تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر جزا کبیر خان اس جنگ میں فتح چاہتی' عدل کے دل کو نہ سہی' سوچ کو پلٹنا چاہتی تھی تو یہ کھیل اتنا مشکل تو نہیں تھا۔ اس کے عشق میں اتنی طاقت تو ضرور تھی جو عدل کبیر کو ایک دفعہ تو پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ بس بلال کبیر خان کے چند قول ہی تو دکھانے تھے اور وہ باپ کے ہر قول اور عہد پہ جان دینے والا کیونکر انکار کرتا؟

لیکن بات یہ تھی اس بااصول پہاڑی لڑکی کو زبردستی کے تعلق، رشتے اور سودے منظور ہی نہیں تھے۔ اس کی تو صرف ایک ہی خواہش تھی۔ عدل خود تمام سچائیوں کو جان کر سچے دل کے ساتھ اس کی طرف پلٹتا۔ چاہے اس خواہش کی تکمیل میں دس سال لگتے یا دس صدیاں۔ اسے انتظار کے زہر سے گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔

اور ایک بات تو طے تھی' عدل کے نام' اس کے حوالے' تعلق اور رشتے کے علاوہ کوئی جزا کبیر کی زندگی میں نہ آنے والا تھا اور نہ آسکتا تھا۔ ایک نام کی لذت سے سرشار وہ عمر کی تمام — پونجی لٹا سکتی تھی۔ کیونکہ عدل کبیر کے نام سے بہتر حروف ابجد میں نہیں تھے۔

پھر ہوا کچھ یوں۔ اس شب عدل اسے زندگی کے نئے سبق سمجھاتا لحہ بہ لحہ کھٹکنے لگا۔ اس نے کہا تھا۔

"جب تمہاری زندگی میں کوئی نیا موڑ آئے مجھے بتانا۔"

وہ عدل کی آنکھوں میں بہتی چمک دیکھنے لگی اور عدل کبیر جیسے منجمد ہوگیا۔ حالانکہ جوئی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے تو سر جھکا لیا تھا۔ مگر بعض جواب خاموشی کے پیراہن میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس کی جھکی آنکھوں میں ٹوٹے خواب تھے۔ وہ خواب جو آنکھ کا سراب تھے۔ مگر جان سے پیارے خواب تھے۔

خاموشی نے بول بول کر عدل کو ایسی گھبراہٹ میں مبتلا کیا کہ وہ ایک ٹک جوئی کے چہرے پہ ابھرتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ کوئی کہانی' کوئی افسانہ کوئی داستان جیسے کھل رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کی کھوج میں پڑ گیا۔ وہاں سنجیدگی تھی' ٹھہراؤ تھا' صبر تھا' ایثار تھا' نرماہٹ تھی' محبت تھی' ہاں محبت تھی' وہ اس کھلے سچ میں الجھ گیا' حیرت میں پڑ گیا۔ پھر خود کو جھٹلانے لگا' ملامت کرنے لگا۔ آخر وہ کس سوچ میں پڑ گیا تھا؟

اس نے بالآخر خود کو جھٹلا دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر گفتگو کے تار جوڑ رہا تھا۔ مسکراتا لہجہ' مسکراتی آنکھیں' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چھیڑنے لگا' کچھ دیر پہلے کی کیفیت کے اثر کو زائل کرنے کے لیے باتوں کے سرے بے ربط جوڑ دیتا۔ جوئی اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھتی اور سوچتی رہی۔

ماحن سے شادی کے بعد وہ کتنا خوب صورت ہوگیا تھا۔

خوشی اور مسرت نے اس کی صحت کو قابل رشک بنا دیا تھا۔ جوئی کی نظر اس پہ ٹھہری نہ پائی۔

"پتا ہے جزا! کہتے ہیں دنیا میں رہنے کے لیے دو بہترین جگہیں ہیں۔ کسی کے دل میں' یا کسی کی دعاؤں میں۔ اب تم مجھے بتاؤ میں تمہارے دل میں ہوں یا دعاؤں میں؟" اس کی آنکھوں میں بڑی شرارتی چمک تھی۔ جیسے وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ یا شاید سچ میں کوئی سوال کر رہا تھا۔

"دونوں میں۔۔۔" اس کا دل نرمی سے پکارا تھا۔ دل کی آواز شاید عدل تک پہنچ گئی تھی۔ تب ہی تو وہ اچانک چپ ہوگیا تھا یا شاید جوئی کے چہرے پہ پھیلے تاثرات اور رنگوں نے اسے منجمد کردیا تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور چلا گیا۔ اک طویل ترین مدت کے لیے۔۔۔ جوئی انگلیوں پہ حساب کرتی تھی۔ اک اک دن جیسے بھاری تھا اور رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔

عدل اور ماحن کے چلے جانے کے بعد زندگیوں پر جمود طاری ہوگیا تھا۔ تنہائی کے اژدھے نے غفیرو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شروع شروع میں وہ بہت خوش تھیں جیسے عدل کو جزا کے شر سے محفوظ کرنے کے احساس سے شاد تھیں۔ مگر گزرتے وقت نے انہیں تنہا' خاموش اور اداس کردیا۔ وہ بھی جوئی کی طرح انگلیوں پہ حساب رکھنے لگیں۔ دن' ہفتے اور مہینے گنتیں۔ عدل اور ماحن کے چلے جانے کے بعد ان کا جوئی سے رویہ بھی بہتر ہوگیا تھا۔ احساس تنہائی نے انہیں جوئی کے بہت قریب کردیا تھا۔ پھر وہ آنے والے وقت میں نہ اسے طعنے دے سکیں' نہ پڑھائی سے روک سکیں' کیونکہ عدل کی جوئی کے لیے دی گئی ہدایات بہت سخت تھیں۔

اس کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا۔ جب اس نے میٹرک کیا تب عدل کی پہلی بیٹی ہوئی۔ غفیرو کو جیسے زمان و مکاں بھول گئے۔ وہ پہلی فلائٹ سے اردن چلی گئیں۔ پھر ان کے آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب جوئی نے انٹر کیا' تب عدل تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی پاکستان نہیں آسکا تھا۔ تاہم وہ جوئی سے غافل بھی نہیں تھا۔ اس کی کامیابیوں پہ تحفے بھیجتا' الگ سے جیب خرچ دیتا۔ البتہ لمبی لمبی کالز کرنے کا اب اسے وقت نہیں ملتا تھا۔ جاب' ماحن اور بچیوں نے اسے الجھا لیا تھا۔ غفیرو جب بھی عدل اور بچیوں کے لیے اداس ہوتیں تو چلی جاتیں۔ واپس آتیں' تب بھی اداس رہتیں۔

پھر پتا چلا۔ ماحن نے جاب چھوڑ دی ہے۔ تب غفیرو کے من کی مراد بر آئی۔ انہوں نے ماحن کو بہت مجبور کیا۔ وہ اسے واپس آجانے کو کہتی رہیں۔ مگر ماحن کے پاس سو بہانے تھے۔ وہ عدل کو تنہا چھوڑ کر بوڑھی پھوپھی کے لیے کیوں آتی؟

غفیرو کو ایک چپ لگ گئی تھی۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہتیں اور اکثر لیدر کے سوٹ کیس کھول کھول کر جانے کیسے کیسے کاغذات نکال کر پڑھتی تھیں۔ تاہم جوئی کو ان کاغذات کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتیں۔ ایسے ہی بہت سا وقت گزر گیا۔

عدل کے مجبور کرنے اور احساس دلانے پر غفیرو نے زبردستی جزا کی منگنی کی۔ پھر اس کی منگنیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اگلے دس سالوں میں اس کی سات منگنیاں ہوئیں اور ٹوٹیں۔ بس آخری منگنی پانچ سال برقرار رہی۔ پھر اچانک وہ بھی ٹوٹ گئی۔ عدل کا اصرار بڑھتا جارہا تھا۔ وہ حیران اور متعجب تھا کہ جوئی کی منگنیاں کیوں ٹوٹ جاتی تھیں؟ اسے اپنی ماں کا ہی قصور نظر آتا تھا۔ ان دس سالوں میں وہ تین' چار دفعہ پاکستان آیا تھا۔ ہر دفعہ وہ جوئی کی منگنی کرکے شادی کی ڈیٹ رکھ کے جاتا اور اس کے وہاں پہنچتے ہی ادھر منگنی ٹوٹ جاتی۔ یہ صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔

وہ عمان میں پوسٹڈ تھا' ان ہی دنوں کی بات ہے۔ عدل پاکستان آنے کی تیاریوں میں تھا۔ اس کا ارادہ تھا وہ جوئی کی شادی کرکے ہی واپس آئے گا۔ اسے ماسٹرز کیے اور جاب کرتے ایک سال ہوچکا تھا اور اب وہ جوئی کی نیا پار لگا کر اپنی ذمہ داری اور فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔

جس دن عدل کو یہاں آنا تھا' اسی دن ان کی زندگیوں میں بھونچال آگیا تھا۔ بچیوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آتی ماحن کا بہت شدید — ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ یوں کہ اس کی جان تو بچ گئی تھی۔ مگر دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئی۔

یہ صدمہ غفیرو کے لیے قیامت تھا۔ ماحن میں ان کی جان تھی۔ تب اس کی معذوری کے صدمے نے غفیرو کو بستر پہ ڈال دیا۔ پھر ایک مدت لگی تھی عدل اور غفیرو کو سنبھلنے میں۔ عدل خود گھن چکر بن گیا۔ وہ ماحن کو لیے ملکوں ملکوں گھوما' اس کے علاج پہ پانی کی طرح پیسہ بہاتا رہا۔ مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ ماحن پھر بستر سے اٹھ ہی نہ سکی۔ عدل کا غم' اس کی پریشانی' اس کے الجھے حالات' نجی زندگی کی بے ترتیبی کچھ بھی غفیرو اور جوئی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ عدل دفتر سے آکر گھر' بچیوں اور ماحن کی دیکھ بھال کرتا' اس پہ ذمہ داریوں کے انبار لگ گئے تھے۔ وہ الجھا' پریشان اور بدمزاج رہنے لگا تھا۔ بچیوں کو پڑھانا' ان کو سنبھالنا' گھر کی دیکھ بھال' کھانا پکانا' کپڑے دھونا اور ماحن کی ذمہ داری۔ اس کے اعصاب جیسے شل ہوگئے تھے۔ وہ نرسیں بدل بدل کر تھک چکا تھا۔ آئے دن نئی میڈ گھر آتی' مگر ماحن کے مزاج میں اتنی تلخی آچکی تھی کہ کوئی بھی ایک ماہ سے زیادہ نہ ٹک پاتی۔

ولید اسے طرح طرح کے مشورے دیتا۔ کبھی کہتا' ماحن اور بچیوں کو پاکستان بھجوا دو' کبھی کہتا مما کو یہاں بلوالو۔ بچیوں کو عدل خود نہیں بھیجتا تھا۔ تینوں بیٹیاں اس سے بہت اٹیچ تھیں۔ پھر وہ ماحن کو کیسے بھیجتا۔ وہ تو معذوری میں طوالت کی وجہ سے آدم بے زار' چڑچڑی اور غصیلی ہوتی جارہی تھی۔ عدل اسے خود سے دور کرنے کی بات کرتا تو وہ دل ہی چھوڑ بیٹھتی۔ تین سال سے وہ ایک عذاب مسلسل میں مبتلا تھا۔ اسے کوئی حل ہی نظر نہ آتا۔ پھر ولید نے اسے مشورہ

دیا۔

"یار! اس طرح نظام چلنا مشکل ہے۔ تمہارے گھر' بچیوں اور مامن بھابھی کو ایک مستقل عورت کی ضرورت ہے جو ان کی دیکھ بھال کرسکے۔ تم اپنی اور میری شادی کروادو۔" ولید کے مشورے نے عدل کی آنکھیں کھول دی تھیں' وہ جیسے بدک گیا۔

"مجھ سے شادی کوئی پاگل عورت ہی کرسکتی ہے۔ یہاں کون اپنی زندگی آگ میں جھونکنے آئے گا۔ مامن کو اب نرسیں برداشت نہیں کرتیں۔ کسی عورت کا کیا حوصلہ ہوگا؟ جو خیر سے میری بیوی بھی ہوگی۔ پھر میری بچیاں ہیں۔۔۔ میں ان کو کسی بے رحم سوتیلی ماں کے حوالے کیسے کرسکتا ہوں۔ نایابا! اپنے نادر مشورے اپنے پاس رکھو۔ البتہ تمہاری شادی کروادوں گا۔ مگر لڑکی تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگی۔" عدل نے سرخ آنکھیں دکھا کر بات پلٹ دی تھی۔

"لڑکی تو ہے نا۔" ولید نے ذرا جوش سے کہا۔ وہ بیٹھے سے اٹھ گیا۔ ادھر عدل بھی چونکا۔

"کون؟" اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"تمہاری کزن۔۔۔ جس نے موتی چور کے لڈو بنائے تھے۔ ارے۔۔۔ وہی جس کی نو' دس منگنیاں ٹوٹی ہیں۔" ولید کا جوش قابل دید تھا۔ تب عدل بھی ٹھٹک گیا۔ ولید نے دس سال کیریئر بنانے اور گھر تعمیر کرنے میں لگائے تھے۔ پھر بہنوں کو بیاہا تھا اور اب وہ ذمہ داریوں سے آزاد تھا۔

"ویسے یار! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہاری کزن بہت حسین ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ پھر تمہارے حوالے سے مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی اتنی منگنیاں کیوں ٹوٹیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" عدل تھوڑا بگڑ گیا۔

"تمہیں احساس دلانا چاہتا ہوں۔ اپنے آس پاس نگاہ ڈالو۔۔۔ وجہ دریافت کرلوگے۔" وہ معنی خیزی سے بولتا اٹھ گیا تھا۔

پھر اسی شب تین سالوں میں پہلی مرتبہ عدل اور مامن کا ایک عجیب بات پہ جھگڑا ہوا۔ مامن کی معذوری کے تین سالوں میں یہ پہلا طویل ترین جھگڑا تھا۔ ولید کی باتوں کے بعد مامن کی بلاوجہ کی ضد نے عدل کو چونکا دیا تھا۔ وہ اسے مجبور کررہی تھی کہ وہ جزا کو خدمت کے لیے یہاں بلوالے۔

"وہ ملازمہ نہیں ہے۔" عدل چیخ پڑا تھا۔

ایک دن تنگ آکر اس نے مما سے جھگڑنا شروع کردیا۔

"میری آپ کو بہت فکر ہے۔ اس یتیم' لاوارث کا سوچا ہے؟ جسے گھر میں باندھ رکھا ہے؟ اس کو بیاہتی کیوں نہیں؟ کیوں اس کی منگنیاں تڑواتی ہیں؟" وہ ماں سے الجھ پڑا۔

"میں نے کبھی اس کی منگنی نہیں تڑوائی۔" مما کی صفائی نے اسے شرمندہ کردیا تھا۔ پھر بھی وہ چیخ کر بولا۔

"پھر اب تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔" جانے وہ اتنا بدمزاج کیوں ہورہا تھا۔

"مامن کی ضد مجھے اور اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ بلا کی احمق ہے۔ جان کر آگ میں ہاتھ ڈالنے لگی ہے۔" انہوں نے فون بند کرکے زیر لب بڑبڑانا شروع کردیا تھا۔ ان دنوں وہ کھوئی کھوئی رہتیں۔ خود سے باتیں کرتیں۔ الجھتیں' غمگین رہتیں' پھر مامن کی مسلسل کالز اور ضد۔ "جوئی کو بھجوادیں۔" مامن نے جانے کیا ٹھان رکھی تھی۔ ان کا دل اس کے جذباتی فیصلوں پہ تھرتھراتا رہتا۔

"جوئی کو پہلے والی جوئی مت سمجھنا۔۔۔ وہ بہت بدل گئی ہے۔ سینکڑوں میں ممتاز ہوگئی ہے۔ نظر ٹھہرتی نہیں اس پر۔" وہ اسے خطروں کا احساس دلاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھولتیں۔۔۔ مگر وہ کچھ سنتی سمجھتی نہیں تھی۔ جانے اس نے کیا ٹھان رکھی تھی۔

تب غفیرہ اچانک آگئیں۔ سچ تو یہ تھا' گھر کی حالت' بچیوں کے اجڑے حلیے اور مامن کی شکستگی دیکھ کر انہوں نے زہر کا گھونٹ بھر کے مامن کے فیصلے سے اتفاق کرلیا۔

"آپ مجھے احمق سمجھتی ہیں مما! پل صراط سے گزر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ خود سوچیں۔ آخر کب تک عدل میری بیماری سے سمجھوتا کیے رہے گا۔ پھر میری بچیاں کیسی اجڑ بچڑ گئی ہیں۔ کن حالوں میں ہیں' نہ اسکول کا کام کرتی ہیں۔ نہ پڑھتی ہیں' نہ ٹھیک سے کھاتی ہیں۔ مجھے' میری بچیوں کو ایک ہاؤس کیپر کی ضرورت ہے۔ جو میرے گھر' بچیوں کو اور مجھے سنبھالے۔ خود کو مالک نہیں بلکہ ایک نگراں سمجھے۔ جو فطرتاً" دبو ہو' لاوارث ہو۔ کوئی خاندان نہ رکھتی ہو۔ جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ ایسی تنہا' لاوارث' بے زبان' دبو اور کمزور لڑکی بھلا کہاں مل سکتی تھی؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔"

وہ بہت سکون کے عالم میں انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کررہی تھی۔ غفیرہ کے اندر اطمینان پھیلنے لگا۔ انہیں مامن کا فیصلہ درست لگا۔ پھر وہ یہی اطمینان لے کر واپس چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن ایک شاپنگ مال میں عدل کی ملاقات ایک طویل عرصے کے بعد واجد صاحب سے ہوئی تھی۔ وہی واجد صاحب جو اس کے بابا کے اسسٹنٹ تھے اور بابا کے آخری وقت میں ان کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ عدل انہیں دیکھ کر ایسے خوش ہوا تھا جیسے اپنے بابا کو ہی دیکھ لیا ہو۔ واجد صاحب بھی عدل سے بہت محبت اور جوش سے ملے۔ وہ بہت خوش مزاج انسان تھے۔ اس سے بڑی بے تکلفی سے بولے۔

"اور شہزادے! کیسی گزر رہی ہے؟ بچے کتنے ہیں؟ اور تمہاری بیوی کیسی ہے؟" وہ اسے لیے کیفے میں چلے گئے۔

"تین بیٹیاں ہیں اور بہت اچھی گزر رہی ہے۔" عدل نے گہرا سانس کھینچ کر بتایا۔ وہ انہیں مامن کی معذوری اور اپنی نجی زندگی کی مشکلات کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ جزا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے اچھی ہی گزرنی تھی۔ تمہارے چچا کی بیٹی' ڈاکٹر صاحب کی بھتیجی۔۔۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کی جان تھی۔ میں جزا سے مل نہیں سکا۔ تاہم بنا اسے دیکھے بھی ایک ایک نقش بتا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی صبح اور شام اسی کے نام سے ہوتی تھی۔" واجد صاحب مسکراتے ہوئے کہیں کھو گئے تھے۔ جبکہ عدل کو کافی پیتے ایک دم اچھو لگ گیا۔ اس نے واجد صاحب کی غلط فہمی دور کرنا مناسب سمجھا تھا۔

"آپ غلط سمجھے ہیں۔ میری شادی جزا سے نہیں ہوئی۔ میری کزن مامن سے ہوئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا' جبکہ واجد صاحب کا منہ کھل گیا۔ یہ اطلاع ان کے لیے حیران کن تھی۔ وہ جیسے بھونچکا رہ گئے۔

"جزا سے نہیں ہوئی؟ کیوں؟ کیا تم نے ڈاکٹر صاحب کی خواہش پوری نہیں کی؟ تم نے عہد نہیں نبھایا؟" وہ بے ربط بولتے چلے گئے تھے۔ پھر جیسے سنبھل کر چپ کرگئے۔ تاہم عدل بے چین ہوگیا تھا۔ وہ ان کی بات قطعاً" نہیں سمجھا تھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" عدل نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔ وہ ان کی بات سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن واجد صاحب اچانک معذرت کرکے اٹھ گئے۔

"کچھ نہیں بیٹا! ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔ یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کا بریف کیس تمہیں ملا؟ وہ امانت چھوڑ گئے تھے تمہارے لیے میں نے بیگم صاحبہ کو دیا تھا۔"

وہ جاتے جاتے پھر پلٹ آئے۔ عدل نفی میں سر ہلانا چاہتا تھا۔ پھر اچانک رک گیا اور اس کے ہاں کہنے پر وہ عجیب سے انداز میں "پھر بھی۔۔۔ تم نے۔۔۔" زیر لب کہتے ہوئے پلٹ گئے تھے۔ ان کا رویہ اور انداز عجیب تھا۔ وہ جاتے جاتے زیر لب بڑبڑا کر رہ گئے تھے۔

"بس آج کل کے بچوں کو اپنی خوشیاں' چاہت' تمنا' محبت عزیز ہے۔ والدین کی خواہش' خوشی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے تھے۔ جبکہ عدل کے سامنے کئی سوالیہ نشان چھوڑ گئے۔ آخر انہوں نے جزا کا ذکر کیوں کیا؟ بابا کیا چاہتے تھے؟ ان کی خواہش کیا تھی؟ انہوں نے مجھ سے ذکر کیوں نہ کیا؟ مجھ سے کہتے'

مجھے بتاتے... وہ الجھتا ہوا گھر آگیا۔ تاہم ان سوالوں کے جواب کھوج نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر کچھ دن مزید گزر گئے۔ عدل کے ذہن سے واجد صاحب کی باتیں نکلتی نہیں تھیں۔ وہ اکثر تنہائی میں واجد صاحب کی باتیں سوچنے لگتا تھا۔ پھر اسے بابا کی گفتگو یاد آئی۔ ان کی باتیں ذہن کے دریچوں پہ دستک دینے لگتیں۔

"تم دو لوگوں کے لیے میں کچھ بھی قربان کرسکتا ہوں۔"

"ایک میں اور ایک؟" اس کا الجھن بھرا سوال ان کے چہرے پہ روشنی بکھیر گیا تھا۔ وہ روشن آنکھوں سے عدل کو دیکھنے لگے۔

"عدل اور جزا..." انہوں نے عدل کی زندگی کے افسانے کو تب ہی مکمل کردیا تھا۔ جب وہ کچھ جانتا نہیں تھا۔ وہ تو اب بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ جاننے لگا تھا۔ واجد صاحب کی گفتگو، بابا کی خواہش، ان کے الفاظ، ان کی پہلی اور آخری تمنا... عدل اور جزا؟

تو گویا اس کے بابا، عدل اور جزا کو عمر بھر ایک ساتھ دیکھنا چاہتے تھے؟ یہ ان کی خواہش تھی، ان کی جنونی خواہش... عدل کا دل مٹھی میں بھر آیا۔

اس نے اپنے بابا کی خواہش کے ساتھ کیا، کیا تھا؟

اسے جوئی یاد آئی۔ ایک خاموش کردار، ایک صابر اور قناعت پسند لڑکی۔ ایک محنت کش، سیدھی سادی لڑکی... جو عدل کو چوری چوری، چپکے چپکے پہروں دیکھتی۔

پھر اس کے چہرے پہ پھیلتے تاثرات، ایک کہانی سناتے، لہروں کی شکل میں چہرے پہ بکھرتے رنگ، اس کی آنکھ میں اتری خاموشی... کتنی بہت پرانی کہانی؟ اور ایک بلکتا ہوا جوش کھاتا بے بس سارا نس... ایک روح میں اتر جانے والی خاموش بے چین، مگر قانع محبت۔

وہ آخری ملاقات!

جو جوئی کے دل کا ہر حال اسے سنا گئی تھی۔ پھر عشق اور مشک بھلا چھپنے والے کہاں تھے؟

وہ جوئی کے اندر کا حال جان کا تڑپ اٹھا تھا یہ نادان لڑکی کس راہ پہ چل پڑی تھی؟ وہ تھرا اٹھا تھا۔ پھر اٹھ گیا، مڑ گیا۔ اک لمبے سفر پہ نکل گیا۔

پھر سچ تو یہ تھا، عدل جان بوجھ کر پاکستان جانے سے کترانے لگا تھا۔ وہ مما کو یہاں بلوا لیتا۔ مگر جوئی کو نہیں... وہ اس کی آنکھوں اور محبت سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ اپنے کمزور ہونے سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ ماس سے بے وفائی نہ کرے۔ اس بات سے خوف کھانے لگا تھا۔

لیکن ایک بات وہ نہیں جانتا تھا۔ جوئی کی محبت میں مقناطیس جیسی طاقت ہے۔ اس کا دل بلاوجہ کھنچا۔ وہ خود کو بہلاتا رہتا۔ خود کو سمجھاتا رہتا۔ جوئی اس کی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے اس کے بارے میں متفکر رہتا ہے۔ وہ خود کو جواز دے کر چپ کروا دیتا تھا۔ مگر اسے سوچنے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ پھر اس کی زندگی میں ماس کی معذوری بھونچال لے آئی۔ وہ بکھرنے اور ٹوٹنے لگا۔ پھر ان ہی دنوں ماس کا اصرار، ضد اور جھگڑے طول پکڑتے گئے۔

وہ جوئی کو یہاں بلوا رہی تھی۔ تب وہ اندر سے کھٹک گیا تھا۔ کیا ماس اپنے کسی مقصد کے لیے جوئی کو استعمال کرنا چاہتی تھی؟ اتنی تو اسے خبر تھی کہ ماس بہت مفاد پرست ہے۔ اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

پھر ان ہی دنوں جزا آگئی اور اس کے آتے ہی جیسے اس کی زندگی کا ہر الجھاؤ، بے ترتیبی ترتیب میں بدل گئی۔ اس نے جادو کی چھڑی سے سب کچھ بدل دیا۔ اس کا گھر پھر سے بن گیا۔ اس کی بچیاں صاف ستھری اسکول جانے لگیں۔ انہیں وقت پہ کھانا ملتا۔ ان کا ہوم ورک مکمل ہوتا۔ گھر بھی صاف ستھرا نظر آتا۔ ماس کی دیکھ بھال بہترین ہونے لگی۔ اس کی دوائی اور

خوراک وقت پہ ملتی۔ جزا اسے صبح سویرے بنا سنوار دیتی۔ اس کی کنگھی کرتی۔ کپڑے استری کرکے دیتی۔ اسے وقت پہ کھانا ملتا، دوا ملتی، وہ دنوں میں بہتری کی طرف آرہی تھی۔

جزا کے آتے ہی عدل کی زندگی میں سکون بھر گیا تھا۔

ادھر ماس نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کی توقع کے مطابق جوئی بے دام کی غلام ثابت ہوئی۔ ایک خاموش کردار... جس کا مقصد اس گھر کی بہتری اور گھر والوں کی خدمت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اور خاص طور پہ ماس کی صحت بہتر ہو رہی تھی۔ وہ جیسے تین سال میں پہلی مرتبہ پرسکون ہوا تھا اور اس کا سکون اب دھیرے دھیرے ماس کو بے سکون کر رہا تھا۔ وہ اپنے فیصلے اور ضد پہ پچھتاتی۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ بہت تکلیف دہ منظر دیکھنے شروع کیے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور اپنے ہی دماغ سے سوچتی تھی۔ اس کے اردگرد خطرے کے الارم بجنے لگے تھے۔ کیونکہ اس کی نگاہ جوئی اور عدل کا بڑھتا التفات دیکھ رہی تھی۔ عدل کی نظروں کے نرم گرم تاثر، جوئی کی فکر کرنا۔ اس کا مشکور رہنا، اس کا خیال رکھنا۔ وہ بچیوں کے ساتھ آؤٹنگ پہ بھی جاتی تھی، پارک میں جاتی، ہر چھٹی کے روز عدل کے ساتھ گھریلو شاپنگ بھی کرتی۔ گھر کی سیٹنگ مرضی سے بدلتی، نئی چیزیں خریدتی، گھر سنوارتی، سجاتی۔

ان کا گھر پھر سے چمک دمک گیا تھا اور ماس کے لیے جوئی کا ہر چیز میں گھسنا اور اپنی مرضی کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ پھر عدل اسے گھر سنوارنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں دیتا تھا، پلٹ کے حساب بھی نہ لیتا۔ اس کے لیے شاپنگ کرکے لاتا، اس کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ وہ کچھ بھی پہن کے آتی، اس کی تعریف کرتا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی جوئی کو اتنی توجہ، محبت اور عزت دیتا تھا اور اب تو جوئی نے اس کا گھر بار سنبھال رکھا تھا۔ اس کی بیٹیوں کا خیال رکھتی تھی۔ انہیں پڑھاتی، لکھاتی، توجہ اور بھرپور محبت دیتی تھی۔ وہ اس کا زیربار رہتا تھا۔

تاہم ماس اب کسی اور رنگ میں دیکھنے لگی تھی۔ اسے یہ التفات ڈپریشن میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ وہ اپ سیٹ رہنے لگی، پریشان ہوتی۔ بے چین رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ غصہ کرنے لگی، طنز کرنے لگی۔

اور جوئی ہمیشہ کی طرح نظرانداز کردیتی، درگزر کردیتی۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت سمجھتی تھی۔ وہ ایک بیمار عورت کے خلاف کیونکر عداوت پالتی۔ لیکن اگلے چند ہفتوں میں وہ زہر بھی اگلنے لگی۔ ہاں، جب سلطانہ آگئی۔

سامنے والے فلیٹ میں ایک بیوہ عورت شفٹ ہوئی۔ وہ نہ صرف بیوہ تھی، بلکہ بانجھ بھی تھی۔ واجبی سی صورت، کچھ موٹی، تھوڑی بھدی۔ وہ اس کی بچیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بہت شریف، نیک اور صوم اور صلوٰۃ کی پابند عورت تھی۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو خصوصی توجہ اور محبت دیتی۔ بلکہ بچوں پہ جان چھڑکتی تھی۔

فارغ اوقات میں اکثر ماس کے پاس آجاتی۔ بلکہ ماس ہی اسے پیغام بھیج بھیج کر بلاتی تھی۔ وہ ماس کے سیکڑوں کام کرتی۔ برتن دھوتی، کپڑے دھوتی، بچوں کو سنبھالتی، نہلاتی دھلاتی۔ اس سیدھی سادی عورت کو جیسے ایک خوب صورت مصروفیت مل گئی تھی۔

جبکہ یہ صورت حال جوئی کے لیے حیران کن تھی۔ اس کا کام بالکل ختم ہوگیا۔ وہ جیسے فارغ ہوگئی۔ ماس، سلطانہ سے کھانا بھی پکواتی تھی اور بچیوں کو بھی اسی کے قریب رکھنے کی کوشش کرتی۔ بلکہ عدل کے بہت سے کام بھی سلطانہ کے سر ڈال دیتی اور سلطانہ ایسی مٹی کی مادھو کہ ماس اسے نچائے جاتی اور وہ ناچے جاتی۔ بچوں کے لنچ بریک کی ٹیچر تھی اور چھوٹے چھوٹے بچے تک اسے الو، بے وقوف بنا کر چکمہ دے کر بھاگ جاتے تھے۔

ماس کو جیسے مفت کی کل وقتی ملازمہ مل گئی تھی۔ جس کی طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ جس کی طرف عدل نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور سلطانہ نامی

عورت اس کا منصوبہ بھی مکمل کر سکتی تھی۔

اس گھر میں جوئی کو اپنا آپ مس فٹ لگتا تھا۔ مامن اب جوئی کو کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ نہ کچن میں جانے دیتی اور نہ بچیوں کو اس کے قریب پھٹکنے دیتی۔

کچھ دن جوئی نے تحمل سے سب کچھ برداشت کیا۔ مامن کی بکواس' اس کی کٹیلی باتیں' اس کا غصہ' طنز اور یہاں سے جانے کے متعلق اہانت آمیز گفتگو۔۔۔۔ پھر اس نے عدل سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ یہاں گھر کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی۔ جب مامن کو اور بندہ مل چکا تھا۔ پھر جوئی کا یہاں رہنا بے کار تھا۔ وہ واپس پاکستان جانا چاہتی تھی۔ اس کا مدعا سن کر کچھ پل کے لیے عدل خاموش ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ اس کے جانے کا سن کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"تم کیوں جانا چاہتی ہو؟ کیا مامن نے کچھ کہا ہے؟" وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ابھی تو وہ چند دن سکون اور چین بھی نہیں لے پایا تھا اور وہ جانے کی بات کرنے آگئی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ مامن کیوں کچھ کہے گی۔ دراصل سلطانہ آپا گھر کی دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ بچیاں بھی ان سے اٹیچ ہیں۔ سو میں نے سوچا' واپس چلی جاؤں۔ چاچی بھی تو اکیلی ہیں ادھر۔"

اس نے ازلی نرم' ٹھہرے لہجے میں بتایا۔ وہ مامن کی بدتمیزیاں چھپا گئی تھی۔ وہ ان دونوں میاں' بیوی میں جھگڑے' لڑائیاں' رنجشیں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ مامن نے اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ وہ عدل کو کچھ نہیں بتاتی تھی۔

"یہ سلطانہ آپا کہاں سے ٹپک پڑیں اور مامن کو دیکھو' بے چاری سی عورت کو کام سے لگائے رکھتی ہے۔" عدل نے قدرے ناگواری سے کہا۔ وہ حیران تھا کہ مامن' سلطانہ آپا سے اتنی اٹیچ کیوں ہے۔

اسے تو کوئی بندہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔

"سلطانہ آپا بہت بے ضرر خاتون ہیں۔ بہت اچھی ہیں اور میرا خیال ہے مامن نے انہیں ہاؤس کیپر کے طور پہ رکھ لیا ہے۔ انہوں نے بہت اچھے طریقے سے سب انتظام سنبھال لیا ہے اور فیچنگ بھی چھوڑ دی ہے۔ اس کا مطلب ہے' انہیں بھی یہ جاب پسند آگئی۔"

جوئی نے بڑے تحمل کے ساتھ وضاحت کی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے تاثرات عدل پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جانے اب عدل سے دوبارہ کبھی ملاقات ہوتی یا نہ ہوتی۔ جانے وہ اس چہرے کو کبھی دوبارہ دیکھ پاتی یا نہ دیکھ پاتی اور جانے زندگی میں اور کتنی ٹھوکریں باقی تھیں۔ جانے اس کے لیے کوئی پناہ گاہ تھی بھی یا نہیں؟

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد "سلطانہ آپا" کی تعریفوں کو نظر انداز کر کے وہ جوئی سے ایک الگ بات پوچھ رہا تھا۔ اپنے مسائل سے ہٹ کر۔

"کیا مطلب؟" جوئی کچھ پل کے لیے ہونق ہو گئی تھی۔ یہ عدل اب کون سے دفتر کھولنے والا تھا؟

"تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" عدل نے پھر سے وضاحت کی۔ جوئی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر کچھ اور جھکا لیا۔ یہ لفظ شادی ... اسے اذیت کی بھٹی سے گزار دیتا تھا۔

"یہاں میری بات کیوں چھیڑ دی؟ میرا کیا ذکر؟" وہ جز بزسی بولی۔

"تم میری ذمہ داری ہو۔ یہ بات کیوں بھولتی ہو؟ آج مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری منگنیاں کیوں ٹوٹ جاتی ہیں؟ کیا مما کی وجہ سے؟"

عدل نے بہت سوچ سمجھ کر نکتہ اٹھایا تھا۔ ولید سے دوٹوک بات کے بعد اس نے جوئی سے اس ٹاپک پہ بات کرنے کا سوچا تھا۔ تاہم مصروفیت میں اسے وقت نہیں مل سکا تھا اور آج جب وقت ملا تو وہ سب کچھ واضح سننا چاہتا تھا۔

"چاچی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔" اس نے جھکے سر کے ساتھ بتایا۔ اسے یہی کہنا تھا۔

"تو پھر؟" عدل حیران ہوا۔

"میں خودکشی کے قابل نہیں۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولی تھی' تب عدل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"یہ کیا جواز ہے۔" وہ خفا ہونے لگا۔

"میرے پاس یہی جواز ہے اور مجھے اس پہ مزید بات نہیں کرنا۔ آپ مجھے واپس بھجوا دیں۔ میری اب یہاں ضرورت نہیں۔ سلطانہ آپا یہاں کا انتظام سنبھال سکتی ہیں۔"

جوئی نے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ تب کچھ دیر تک عدل اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر بڑے تحمل کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔

"تم واپس ضرور جانا۔۔۔ مگر اب ایسے نہیں۔ میں تمہاری شادی کروں گا۔ پھر اپنے شوہر کی مرضی سے جو دل چاہے کرنا۔"

اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ گویا وہ کچھ ٹھان کے بیٹھا تھا۔ اس کی روح جیسے فنا ہو گئی۔ اسے بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ بے یقینی سے عدل کو دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ اس کا دل بھر آیا۔ اس کے آنسو بے آواز گرنے لگے۔ عدل اس کے رونے پہ ششدر رہ گیا تھا۔

"مجھے شادی نہیں کرنا۔" وہ بے آواز روتی رہی۔

عدل اسے دیکھتا رہا۔ اسے جوئی کے رونے کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور جتنی سمجھ میں آئی تھی' وہ اسے واضح نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دل جیسے مٹھی میں آگیا۔ وہ جوئی کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے کی وجہ سننا چاہتا تھا۔ حالانکہ وجہ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ مگر زبان تک کیسے آتی؟ وہ اتنا ناسمجھ تو نہیں تھا۔

"کوئی وجہ نہیں۔" اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے اس کے انجان پن پہ۔ جوئی کو دکھ ہوا تھا۔ وہ اس کے دل تک پہنچ ہی نہیں پاتا تھا۔

"تو پھر اپنا مائنڈ میک اپ کر لو۔ میں ولید سے تمہارا نکاح کرنے والا ہوں۔" عدل نے جیسے فیصلہ سنا کر اسے فنا کر دیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"میں نکاح نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتیں۔" وہ ایک دم دھاڑا تھا اور اس کی دھاڑ نے جوئی کو سہما دیا۔ وہ پہلی مرتبہ بہت بلند آواز میں جوئی سے مخاطب ہوا تھا۔

"نکاح کے اوپر نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے سہم کر سوال کیا۔ بڑا غریب سا لاچار سا سوال تھا۔

عدل کے سر پہ جیسے آسمان آگرا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔ وہ اچانک اسے بتا دے گی؟ یہ جوئی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"تمہارا نکاح؟ کس سے ہوا؟" عدل بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی بھر گئی تھی۔ اسے لگا جیسے کوئی قیمتی متاع اچانک لٹ گئی تھی۔ وہ اپنی کیفیات سمجھ ہی نہ پایا۔

"مامن اور چاچی کو پتا ہے۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔" وہ پل صراط پہ چل رہی تھی۔ بالآخر اس نے آر پار ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ انہیں پتا ہے اور مجھے کیوں نہیں خبر؟" عدل اس جھٹکے سے بمشکل سنبھلا تھا۔

جوئی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ جو عدل کی آنکھوں تک آتی آتی پلٹ گئی۔ جوئی نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ کیونکہ وہیل چیئر گھسیٹتی ۔۔۔ مامن آگئی تھی۔ وہ جوئی کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"کون سے راز و نیاز ہو رہے ہیں؟" مامن کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی' حقارت تھی۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

مامن کو دیکھ کر جوئی پلٹ گئی تھی۔ اسے اپنی پیکنگ بھی کرنا تھی۔ جوئی کے جاتے ہی عدل' مامن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مامن کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ ایک فائل بک' کچھ کاغذات' ایک کتاب یا پھر ڈائری' وہ سمجھ نہ پایا' یہ سب کیا تھا؟

وہ مامن سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے نئی بات شروع کر دی۔ وہ عدل سے دوسری شادی کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ ہر صورت اسے شادی کے لیے

رضامند کرنا چاہتی تھی۔ عدل کی شادی میں اس کے لیے بھلائی پوشیدہ تھی۔ وہ چاہتی تھی عدل اس کی بات مان لے اور اس کی منتخب شدہ لڑکی سے شادی کرلے۔

وہ اپنی بیمار بیوی کو سمجھا رہا تھا۔ اسے شادی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے سارے وہم نکال دے۔ عدل بے وفائی کرنے والا یا بدلنے والا نہیں۔ مگر مامن کو کون سمجھاتا؟ وہ آج عدل سے عہد لے کر اسے باندھ دینا چاہتی تھی۔ ایک بدصورت عورت کے ساتھ۔

"تم شادی کرلو عدل! اس گھر کو ایک سمجھ دار' نیک اور خدا ترس عورت کی ضرورت ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسے قائل کررہی تھی۔ شاید وہ قائل ہوجاتا' اگر روشنی کی ننھی سی لکیر اس کی توجہ نہ ہٹاتی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ وہ روشنی کی ننھی لکیر کو دیکھنے لگا۔ مامن اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی آخر عدل نے تنگ آکر کہہ ہی دیا۔

"اچھا۔ تو شادی کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہوگی۔ ایسی عورت جو اس گھر کو جوڑ کے رکھے۔ ایسی عورت کہاں سے دستیاب ہوگی؟" وہ روشنی کی ننھی لکیر سے نظر ہٹا کر استہزائیہ بولا۔

"لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے۔" اس کی آنکھیں جگمگا گئی تھیں۔ جیسے من چاہی مراد بر آئی تھی۔

"کون لڑکی؟" وہ الجھ گیا۔ ذہن کی اسکرین پر جوئی کا چہرہ روشن ہوا۔ کیا مامن نے جوئی کو؟

اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پایا تھا۔ اس کا ذہن جیسے بند ہونے لگا۔

"یہ سلطانہ۔" مامن نے اس کے سر پہ جیسے دھماکہ کیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

"سلطانہ آپا؟" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ پھر اس کے تیور ہی بدل گئے۔ رنگ ہی بدل گیا۔

"اس حادثے میں تمہارا دماغ بھی متاثر ہوا ہے۔ مجھے تمہارے دماغ کا بھی ٹریٹمنٹ کروانا ہوگا۔ پاگل ہوچکی ہو تم۔" عدل کا دل چاہا مامن کے منہ پہ رکھ کے طمانچہ مارے۔ وہ ایک بیوہ مسکین عورت کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہی تھی؟ وہ عورت جو ممتا کی پیاسی تھی اور اپنی پیاس مٹانے کے لیے اس کے گھر کا بوجھ بخوشی اٹھا رہی تھی۔

اسے مامن کی خود غرضی پہ تاؤ آیا' غصہ آیا' دکھ ہوا' اس کا شدید رد عمل مامن کو بھی اشتعال دلا گیا تھا۔ وہ اپنی سدھ بدھ بھلا گئی تھی۔

"تو تم نے کیا سوچ رکھا تھا؟ میں تمہاری شادی جوئی سے کروادوں گی۔ میری ناک تلے کھیل رچا رہے تھے۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ اور وہ دو ٹکے کی مکار عورت تم پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ اٹھا کر باہر پھینک دوں گی اسے۔ پہلی فرصت میں اس کی سیٹ بک کرواؤ۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کرسکتی۔"

مامن کا دماغ الٹ گیا تھا اور اس نے اپنے اندر کا زہر اگل دیا۔

"میں تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ تمہارے بدلتے انداز اور جوئی کی طرف جھکاؤ۔ اسی لیے تمہاری شادی کروانا چاہتی تھی۔ مجھے تمہارے ارادے نیک نہیں لگتے تھے۔ مگر جس کی طرف تم مائل ہورہے ہو۔ وہ پہلے سے کسی کے نکاح میں ہے۔ مجھے ممانے بتایا۔ وہ اپنے کزن کو چاہتی ہے۔ اسی کے لیے ابھی تک انتظار میں بیٹھی ہے۔ شاید اس کا کوئی پرانا عاشق' مورکھ کا باسی۔ اس کا ماموں زاد۔"

وہ جوش جذبات اور غصے کے عالم میں عدل کو جوئی کے پرانے فرضی عشق کی داستان سنا رہی تھی۔ اسی جوش میں اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری اٹھا کر عدل کی طرف اچھالی۔

"اس ڈائری کو پڑھو۔ جوئی کے عشق کا لفظ لفظ' وہ اپنے کزن کی محبت میں گرفتار ہے۔ جانے کتنے سالوں سے۔"

اس نے آگ بگولہ ہوکر وہیل چیئر گھسیٹی' اسی اثنا میں ہاتھ سے فائل بک نیچے گرگئی تھی۔ اک پیلا' خستہ اور کمزور کاغذ پھڑپھڑانے لگا۔ مامن خود حیران رہ گئی۔ یہ کاغذ بھلا کیسا تھا؟ اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل ہوگیا تھا؟ اس نے پہلے کیوں نہ دیکھا۔

عدل نے جھک کر کاغذ اٹھایا۔ پیلا' خستہ حال کاغذ۔ کئی سالوں کے راز کا امین۔ اتنے سال کے دبے راز کو آج ہی ظاہر ہونا تھا؟

روشنی کی لکیر نے آج ہی عدل کی آنکھوں میں گھسنا تھا؟ مامن جیسے ششدر رہ گئی تھی۔ یہ ممانے کیا کیا تھا؟ بابا کے بریف کیس میں کیسا اژدھا چھپا کر بھیجا؟ لیکن یہ فائل بک بریف کیس میں نہیں آئی تھی۔ یہ ڈائری بریف کیس میں تھی۔ فائل بک تو ڈاک کے ذریعے آئی تھی۔ آخر اسے کس نے بھیجا؟ اس کا دماغ الٹ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ دبی آواز میں پھر سے چیخا تھا۔ مگر جواب مامن کے پاس نہیں تھا۔ جواب جزا کبیر کے پاس تھا۔ وہ عدل کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکائے اسے کچھ بتا رہی تھی۔ جانے وہ کب آئی تھی' جانے کب سے کھڑی تھی۔

"یہ نکاح نامہ ہے۔ بہت سال پہلے ڈاکٹر چاچو کی رضامندی سے ہونے والا نکاح۔"

اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ اسے بولنا ہی تھا۔ آج صدیوں کے لاوے کو باہر لانے کا وقت آگیا تھا۔ آج عدل کو سب کچھ بتانے کا وقت آگیا تھا۔ وہ بولتی رہی' روتی رہی۔

"یہ دو بچوں کا نکاح تھا جو بہت کم سن تھے۔ یہ نکاح مورکھ میں ہوا۔ میری ماں کی خواہش اور آخری تمنا کے احترام میں۔ ڈاکٹر چاچو نے میری ماں سے محبت کا حق ادا کیا تھا۔ اس نکاح کے لیے عفیو چاچی راضی نہیں تھیں۔ اس لیے کہ وہ میری ماں سے نفرت کرتی تھیں۔ میری ماں' ڈاکٹر چاچو کی منگیتر تھیں۔

جب چاچو نے منگنی کو ختم کیا' تب نانی کی ضد پہ میری ماں کو میرے باپ سے بیاہ دیا گیا اور چاچو کو عمر بھر کے لیے معتوب ٹھہرایا گیا۔ پھر اپنی باقی عمر چاچو نے کفارے ادا کرنے میں گزار دی۔ وہ اپنے دل میں ملال کرتے تھے۔ میری ماں کے دل توڑنے کا ملال' میرے دادا کی پگڑی جھکانے کا ملال' میری اماں کا روگی دل کا ملال' نانی کو دکھ دینے کا ملال' نانی کی نفرت کا ملال' میری بدحال زندگی کا ملال اور اسی ملال نے چاچو کی جان لے لی۔

چاچو یقیناً' یہ سب باتیں آپ کو خود بتاتے۔ مگر موت نے انہیں مہلت نہیں دی تھی۔ پھر وہ یہ راز اپنے اسسٹنٹ واجد صاحب کے حوالے کرگئے۔ واجد صاحب نے موقع کی نزاکت دیکھ کر ایک عقل مندی کی اور چاچو کے پاس محفوظ نکاح نامے کی فوٹو اسٹیٹ کروالی۔ باقی سامان عفیو چاچی کے حوالے کر آئے۔ جو آپ کے لیے امانت تھا۔ جو آپ تک کبھی نہ پہنچا۔

چاچو کا یہ بریف کیس پاکستان سے صرف پراپرٹی کے کاغذات لے کر آیا اور صرف ایک ڈائری۔ جو چاچی نے جان بوجھ کر بھجوائی۔ میرے سامان سے جانے انہوں نے کس طرح' کتنے سال پہلے ڈھونڈ نکالی تھی۔

اس ڈائری میں میرے معاشقے کا قصہ ہے۔ ایک پہاڑی لڑکی کے عشق کا قصہ۔ اس کے دکھوں کا حال' اس کی تکلیفوں کی داستان جسے حذف کرکے عشق اور محبت کے قصے کو واضح کیا گیا۔ وہ پہاڑی لڑکی اپنے ایک کزن سے محبت کرتی تھی۔ بہت لڑکپن سے جب اس نے اپنے کزن کا نام سنا اور اسی نام کی تسبیح کو اپنا ورد بنالیا۔

اس کا کزن اس پہاڑی لڑکی کے عذاب لمحوں کا ساتھی تھا۔ وہ اس کا پہلا اور آخری خواب تھا۔

پھر جب وقت اس کے خواب کی تعبیر بن کر آیا اور وہ پہاڑی لڑکی آبلہ پائی کا سفر تمام کرچکی تو اسے خبر ملی' جس رستے پہ وہ اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ وہ رستہ اس کی منزل تک جانے والا نہیں تھا۔ تب اس لڑکی کا دل فگار ہوگیا۔ جسم تھک گیا۔ روح نڈھال ہوگئی۔ پھر بھی ایک صبر نے اسے کبھی راہ سے بھٹکنے نہ دیا۔

وہ پہاڑی لڑکی چاہتی تو اپنے کزن کی مہندی والی رات سارے سچ سامنے اٹھا لاتی۔ اپنے داہنے بازو پہ بندھی تھیلی کا راز کھول دیتی۔ مگر اس لڑکی کے ظرف نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی کی محبت کو تباہ کردے۔

بس اس لڑکی نے اپنی محبت کے ایک ایک بار کو خاموشی سے اس ڈائری میں اتار دیا۔ یہ ڈائری جو چند

سال پہلے غفیو چاچی کے ہاتھ لگ گئی۔

اور جانے یہ صبر کی انتہا تھی یا ظرف کی جب چاچی نے اس لڑکی کے پاس محفوظ آخری ثبوت بھی پھاڑ دیا' تب وہ لڑکی بے بس ہو گئی' لاچار ہو گئی' پھر بھی اپنی زبان نہ کھول پائی۔ اس اصول پسند پہاڑی لڑکی کو کسی کے آنسوؤں کی سرزمین پہ اپنی محبت کا تاج محل بنانا گوارا نہ تھا۔ سو چپکے سے ہر اس رستے' ہر اس منزل سے ہٹ گئی جو عدل کبیر خان تک لے جانے والی تھی۔

اس لڑکی کی ڈائری میں بند یہ لاچار محبت ہر اس نامحرم مرد کے پاس پہنچی جس کے نام کی انگوٹھی اس لڑکی کی انگلی میں سجی تھی۔

آپ نے پوچھا تھا' میری اتنی منگنیاں کیوں ٹوٹیں؟ شاید اب آپ کی سمجھ میں آجائے۔ وہ آپ کا منہ بند کروانے کے لیے میری منگنی کروا دیا کرتی تھیں' پھر میرے معاشقوں کے قصے خود ان لوگوں تک پہنچا دیتیں' تاکہ یہ نام نہاد منگنی ٹوٹ جائے۔

ظاہر سی بات ہے۔ اگر منگنی قائم رہتی تو شادی کا تقاضا ہوتا۔ پھر نکاح کے اوپر نکاح کروانے کا گناہ غفیو چاچی کیسے اپنے سر لے لیتیں۔ انہوں نے دس سال یہ کھیل کھیلا۔ دس سال اور بھی کھیل سکتی تھیں۔ مگر تقدیر نے ورق الٹ دیے۔

مامن کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ پھر اس کی معذوری... چاچی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ آخر چاچی کو مامن سے ایسی ہی محبت تھی جیسی ڈاکٹر چاچو کو مجھ سے تھی۔ بس محبت کے تقاضے مختلف تھے' محبت نے چاچی اور مامن کو خود غرض بنا دیا۔

یہ مجھ پر میرے ماموں زاد کے حوالے سے کیچڑ اچھالنے والی مامن اس نکاح کے بارے میں تب سے جانتی ہے جب میں مورکھ میں ایک بدحال اور کیڑے مکوڑوں سے بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ مامن کو خبر تھی۔ عدل کے نکاح میں اس سے پہلے جزا کبیر تھی۔ تاہم مامن کے نزدیک وہ پیلا خستہ حال کاغذ ذرہ بھر اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ غفیو چاچی کی نظر میں بھی کوئی اوقات نہیں تھی۔

اور میں تو ان دونوں کے نزدیک زمین پر رینگنے والے کیڑے سے بھی بدتر تھی۔ پھر اسی بدتر جزا کی انہیں ضرورت پڑ گئی۔ چاچی اور مامن کی مشترکہ پلاننگ سے مجھے یہاں بلوایا گیا۔ تب مامن کی نگاہ میں میرے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا۔ اسے مجھ جیسی دبو' لاوارث اور احسان تلے دبی نوکرانی کی ضرورت تھی۔ جس پر وہ آرام سے حکومت کر سکتی۔ تاہم مجھے دیکھ کر اس کے خدشات پھر سے لپک آئے۔

پھر اسے سلطانہ آپا نظر آ گئیں۔ وہ بدصورت ... لاوارث .... ڈھلتی عمر کی .... بانجھ ... وہ زیادہ فائدے پہنچا سکتی تھیں' وہ عدل کی بیوی بن جائیں... بس یہی کافی تھا۔ مامن کو ایک نرس' آیا' ملازمہ اور سوکن سب کچھ سلطانہ آپا میں میسر آجاتا۔ اس کی پلاننگ کوئی معمولی نہیں تھی۔ بہت ٹھوس تھی۔ سب کچھ بہت آسان تھا۔ آپ کو سلطانہ آپا کے لیے منانا آسان تھا۔ سو دلیلیں تھیں۔ ہزار جواز تھے۔ مگر اللہ کی پلاننگ کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا۔

جب مامن نے اشتعال میں آکر مجھے گھر سے نکالا' تب واجد صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں کمپاؤنڈ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ واجد صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ تب میں بہت شکستہ تھی' ایک ہمدرد وجود کو پا کر سب کچھ بتانے لگی۔

واجد صاحب نے میری کمزوری اور بزدلی پہ مجھے بہت ڈانٹا انہوں نے کہا۔

"عدل کو بے خبر رکھ کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر میں بزدلی کا ثبوت نہ دیتیں تو حالات مختلف ہوتے۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

تب واجد صاحب نے مجھے تسلی دی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ایک ثبوت موجود ہے اور وہ ثبوت اسی فائل بک میں واجد صاحب نے بھیجا۔

میں یہ سب کچھ کبھی نہ کہتی' کبھی نہ بتاتی' اگر بات میرے کردار تک نہ آتی۔ دس سال گزر گئے تھے دس سال اور گزر جاتے مامن مجھ پر کیچڑ اچھالتی رہی

اس نے میری ماں کو گالی دی... میرے لیے یہاں رہنا محال ہے۔ آپ مجھ پر ایک کرم کریں۔ مجھے واپس بھجوا دیں۔"

اس نے عدل کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ خاموش ہوئی تو کمرے میں موجود تینوں نفوس کے سانس تک رک گئے۔ یہ معمولی سی دو ٹکے کی جوئی جسے کبھی بولنا نہیں آتا تھا۔ آج کیسے مامن کی اصل صورت سے پردہ کھینچ گئی تھی۔ مامن کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کے لیے عدل کی گرم نگاہوں کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔

وہ تو اتنے انکشافات پہ دم بخود کھڑا تھا۔ وہ جوئی جو اس کی ذمہ داری تھی' بابا کی چھوڑی ہوئی امانت تھی۔ اس کے ساتھ ظلم ہوتے رہے۔

وہ اس کے نکاح میں تھی۔ اس کی منکوحہ تھی اور وہ بے خبر تھا۔ اتنے سال سے بے خبر تھا۔ اتنی بڑی حقیقت سے دور تھا۔ وہ جیسے پاگل ہو کر چیخ پڑا تھا۔

"میرے گھر کی عورتیں اتنی شاطر اور مکار؟ ایک میری ماں اور دوسری میری بیوی؟"

اس کا دماغ جیسے سنسنا رہا تھا۔ وہ ایک نمبر فون پہ ملا رہا تھا۔ "پورے دس سال..." وہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ اس کا سن ہوتا دماغ جھٹکے کھانے لگا۔ پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ اس کے دماغ سے گرم شعلے نکلنے لگے۔ اس کے لبوں سے انگارے پھوٹنے لگے۔ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"جزا کی زندگی کے دس سال ضائع کرنے کا آپ کو کیا حق پہنچتا تھا؟ اسے فٹ بال کی طرح آپ دونوں نے اپنی ٹھوکر پہ رکھا۔ جب چاہا دھتکار دیا' جب ضرورت محسوس کی اٹھا لیا اور پھر جب چاہا ٹھوکر مار دی۔ پورے دس سال وہ آپ کے پاس رہی مما! اتنے سالوں اس نے آپ کی خدمت کی' آپ کو سکھ دیا۔ آرام دیا۔ اتنے سال کوئی پالتو جانور بھی پالیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ پر آپ کو ایک لاوارث انسان سے محبت نہ ہو سکی؟ آپ کو محبت کیسے ہوتی؟

آپ کا دل نرم کیسے ہوتا؟ آپ کے دل میں تو سالوں کا غبار اور نفرت جمع تھی۔ ایک مری ہوئی عورت سے نفرت' اتنا ہی سوچ لیتیں بابا نے آپ کے بھائی کی دو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھ کر پالا محبت دی۔ آپ ان کے بھائی کی ایک بیٹی کو برداشت نہ کر سکیں آپ کا ظرف اتنا چھوٹا نکلا۔

آپ نے تو مجھے میرے بابا کی قبر کے سامنے بھی شرمسار کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے گناہ گار کر دیا ہے مما! میں اپنے باپ کا کوئی قول نہ نبھا سکا۔ میں ان کی چھوڑی ہوئی امانت کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔ آپ نے مجھے جزا کی نظر میں بے مول کر دیا۔ آپ نے مجھے میری ہی نظر میں دو کوڑی کا کر دیا۔ کیا میں اتنا کمزور اور بے وقوف تھا؟ جو دو عورتوں کی چال کو سمجھ نہ پایا؟ میں اپنی زندگی کی مشکلات میں الجھ کر جزا کو نظر انداز کر گیا۔ آخر میں نے خود وجہ کھوجنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اتنی صاف' سیدھی اور سچی کہانی تھی۔ پھر بھی میں جان نہ پایا اور آپ نے میرے انجان پن سے فائدہ اٹھا لیا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا مما! جزا کی زندگی سے کھیل کر اچھا نہیں کیا۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

عدل کے الفاظ نے مامن کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ تو گویا اس کی نادانی اور چال بازی جزا اور سزا کی گھڑی اٹھا لائی تھی؟ اب کیا ہو گا؟ عدل کیا کرے گا؟ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ مامن کو بیٹھے بیٹھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اسے اپنی کشتی ڈولتی ہوئی نظر آئی۔ کل تک عدل اور جزا کی زندگی کے اختیار اس کے ہاتھ میں تھے۔ آج سارے اختیار چھن گئے تھے۔

عدل بقائمی ہوش و حواس جزا کبیر کو سارے اختیارات سونپ رہا تھا۔ وہ جوئی جس کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ مورکھ کی اجڈ گنوار جوئی۔ جسے ڈھنگ سے بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ آج مامن کی زندگی کا فیصلہ کرنے والی تھی۔ اسے یہ اختیار عدل نے دیا تھا۔ مامن کا عشق عدل' اس کی محبت عدل... آج جیسے سب کچھ

لٹنے کا دن تھا۔ اس کی جلد بازی، بد زبانی، خود غرضی جوئی کو زبان کھولنے پر مجبور کر گئی تھی۔ آج جیسے قیامت آگئی تھی۔

عدل نے فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ماہن کے پاس آرہا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب تھوڑا جھک آیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ وہیل چیئر کی ہتھی پہ جما دیے تھے۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرد آواز میں زہر پھونک رہا تھا۔ وہ دیکھ ماہن کو رہا تھا اور مخاطب جوئی سے تھا۔

"میں عدل ہوں جزا! اپنے نام کی لاج نہ رکھوں تو لعنت ہے مجھ پر۔ آج بتاؤ تم۔۔۔ کیا حساب لوں؟ کیا سزا دوں؟ تمہارے دس سال کا بدلہ۔ دس سال کی سزا سنا کر لوں؟ کہو، کیا کہتی ہو، میں عدل ہوں۔۔۔ اور آج تمہارے سامنے عدل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے طلاق نہیں دوں گا۔ خود سے جدا کر دوں گا۔ یہ اس کے کیے کا بدلہ ہے۔ پورے دس سال کی سزا۔۔۔ انگلیوں پہ گنے گی اور یاد کرے گی۔ تمہارے دس سال ضائع کرنے کی سزا۔"

وہ ایک ایک لفظ سے ماہن کو چھیدتا جوئی سے مخاطب تھا۔ اس کا لہجہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ جیسے ماہن کی محبت اور آنسوؤں سے پگھلے گا نہ لڑکھڑائے گا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بھالے اتارتا بہت مدھم لہجے میں بول رہا تھا۔ پھر گم صم کھڑی جزا کی طرف پلٹ آیا۔ ویسے ہی نپے تلے قدم اٹھاتا۔ بہت سنجیدگی سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"اب بولو جزا! فیصلے کا اختیار تمہارے پاس ہے۔"

جوئی کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی تھی۔ ماہن کی زیادتیوں کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ عدل اور ماہن کبھی جدا ہوں۔ وہ ان دونوں کی محبت اور چاہت کی خود گواہ تھی۔

"اور میں جزا ہوں عدل! سزا کا اختیار نہیں رکھتی۔ بہت حقیر ہوں۔ ایسا اختیار لے کر متکبر بھی نہیں ہونا چاہتی۔ میرے ساتھ جو بھی ہوا۔ اسے اپنا نصیب سمجھتی ہوں۔ میرے ہاتھ کی لکیروں میں عدل نہیں۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟ آپ کی زندگی کے تین اصول تھے۔ پھر ایک کیسے بھول گیا؟ آپ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ آپ کا یہ اصول میں نے اپنا لیا۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ یہ میرا پہلا اعتراف ہے۔ میں ماہن سے بھی محبت کرتی ہوں، یہ میرا دوسرا اعتراف ہے۔۔۔ اور میں جس سے محبت کرتی ہوں، اسے معاف کر دیتی ہوں۔ آپ کے قول میرے لیے انمول ہیں۔ میری زندگی کا حاصل۔۔۔ آپ کی محبت کے صدقے سب کچھ بھلا سکتی ہوں۔ میری خواہش ہے آپ اور ماہن ہمیشہ آباد رہیں۔ میں رہوں یا نہ رہوں۔"

اس نے عدل اور ماہن کو منجمد کر دیا تھا۔ ماہن کا سر جھک گیا۔ نظر جھک گئی۔۔۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کے سامنے بہت حقیر ہو گئی۔ خود کو بونی سمجھنے لگی۔ اسے اپنا عمل یاد آیا۔ اپنے لفظ یاد آئے۔ جوئی کو دھتکارنا یاد آیا۔ اسے گھر سے نکالنا یاد آیا۔ اسے دی گئی گالیاں یاد آئیں۔ وہ رو پڑی، جب بازی ہاتھ سے نکل گئی تو اسے رونا ہی تھا۔

"مجھے معاف کر دو جزا! تم واقعی جزا ہو۔۔۔ کسی نیکی کا صلہ ہو۔ میرے پاس الفاظ نہیں۔ میں کس طرح تم سے معافی مانگوں۔" اس نے جھکنا ہی تھا۔

وہ عدل کی آنکھ میں اتری حقارت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ عدل کی جدائی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عدل تک پہنچنے کے لیے جزا تک آنا ضروری تھا۔ آج وہ کتنی قلاش ہو گئی تھی۔ اپنے برے عمل اور بری سوچ کی وجہ سے عدل تک جانے کے لیے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ کوئی اس سے بڑھ کے مفلس تھا آج؟

"گناہ گار نہ کرو ماہن! میں کیا میری اوقات کیا۔" اس نے ماہن کے بندھے ہاتھ آگے بڑھ کے کھول دیے تھے۔ پھر بغیر عدل کی طرف دیکھے آہستگی سے بولی۔

"مجھے واپس بھجوا دیں۔" اس کا لہجہ اور آنکھ نم تھی۔ وہ کس قدر شکستہ نظر آرہی تھی۔ عدل کے دل پر بوجھ آگرا۔

"میں تمہیں واپس بھیج دوں گا۔ مگر تم کہاں جاؤ گی؟ میرے گھر تو کبھی نہیں جاؤ گی اور مور کھ بھی نہیں جاؤ گی۔ اس بھری دنیا میں میرے گھر اور دل کے علاوہ تمہیں اور کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ملے گا۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ دس سال کیوں خاموش رہیں۔ کیسا صبر کا جام پی رکھا تھا۔ خود سارے اعتراف کر لیے۔ اتنے انکشاف کر دیے۔ تم اپنے جس کزن سے محبت کرتی ہو، تمہارا وہ کزن بھی تمہیں بہت چاہتا ہے۔ اس لیے کہ تم اس کے باپ کی روح کا سکون ہو اور اس لیے بھی کہ تم دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں جزا! تم جہاں بھی رہو۔ تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔ کہو گی تو میں تمہیں آزاد کر کے کسی بہت قدر دان بندے سے بیاہ دوں گا اور اگر چاہو گی تو میرے دل کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں، تم جانتی ہو نا۔۔۔ میں اسے بھی نہیں چھوڑتا جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ جزا ہو یا ماہن۔"

عدل کی آنکھوں میں نرم گرم تاثرات ابھر آئے تھے۔ ماہن نے شدت جذبات سے آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کی پلکوں کی باڑ سے ملال، ندامت شرمندگی کے آنسو ٹکراتے رہے۔

جبکہ جزا کی آنکھ سے تشکر کے آنسو بہتے رہے۔ آخر عدل نے اس کے کانوں میں امرت اتارا تھا۔ اس کی جلتی بلتی پیاسی روح ذرا سی بوند پا کر ہی سیراب ہو گئی۔ اس کا دل سجدہ شکر بجا لایا۔ تو اللہ نے اسے عدل کبیر خان عطا کر دیا تھا۔ اس کا صبر اور دعا رنگ لے آئی۔

وہ ہاری بازی جیت گئی۔ جبکہ ماہن جیتی بازی ہار گئی تھی۔

وہ کتنی بدنصیب تھی نا؟

☼ ☼ ☼

عدل کے لیے جزا کے بتائے گئے انکشاف معمولی نہیں تھے۔ کیا کوئی اتنا صابر ہو سکتا ہے؟ اتنے سال خاموشی کی بکل اوڑھ سکتا ہے؟ اتنے بڑے سچ کو چھپا سکتا ہے؟

اسے اپنی ماں سے بہت شکوے تھے۔ ماہن سے بہت گلے تھے اور سچ تو یہ تھا اپنی ماں اور ماہن کو جزا کے مجبور کرنے پر معاف کر دینے کے باوجود بھی اپنے دل کو بہت تنگ پاتا تھا۔

پھر وقت کچھ آگے کھسک گیا۔ عدل کی زندگی میں ترتیب آگئی۔ اس کا گھر اور دل آباد ہو گیا۔ جزا کے سلیقے، محبت، خلوص نے اس کے گھر میں رنگ ہی رنگ بھر دیے۔ اس کی بیٹیوں کی اچھی تربیت جزا کی محنت کا نتیجہ تھی۔ اس کی بیٹیاں ذہین، فرماں بردار اور بہت سلجھی ہوئی بچیاں تھیں اور جزا کی ہی کوششوں، محبتوں اور انتھک محنت کی بدولت ماہن بھی بیساکھی کے سہارے چلنے لگی تھی۔ ہر گزرتا دن عدل کو جزا کا اور بھی زیر بار کرتا تھا۔ اس کے دل میں جزا کی قدر اور محبت بڑھ جاتی تھی۔

عدل نے ایک مرتبہ ماہن سے کہا تھا۔

"یہ کیسی محبت تھی جو تم مجھ پہ اعتبار نہ کر سکیں۔ کیا میں اتنا دل پھینک تھا جو جوئی سے نکاح کا سن کر اس کا اسیر ہو جاتا؟ جب تم نے بابا کے سیف میں نکاح نامہ دیکھ لیا تھا، پھر مجھے کیوں نہ بتایا؟ کیا یہ جرم معمولی ہے؟ اس کے دس سال ضائع کر دیے، کیا یہ گناہ معمولی ہے؟ تم مجھے تب بتا دیتیں۔ میں اسے فارغ کر دیتا۔ اس کی شادی کر دیتا۔ وہ خوش حال زندگی گزارتی۔ مگر تم نے اور ممانے تو اس سے بیر باندھ رکھا تھا۔ میں حیران ہوں، تم اتنے اچھے منصوبے بناتی ہو۔ اتنی بہترین سازش کرتی ہو، اتنی جامع پلاننگ کرتی ہو۔ میں تو اب بھی حیران ہوں اور میری حیرت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

اور تم نے بڑی محبت کے ساتھ جزا کو ادھر بلایا تھا نا۔۔۔ مجھے تمہاری جزا کے ساتھ محبت کی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے۔ تمہیں جزا سے بڑھ کے اس گھر کے لیے کوئی نوکرانی نہیں مل سکتی تھی نا۔ دبو، کم گو، مظلوم، لاوارث، جس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ جو ساری عمر

تمہارے اشاروں پہ ناچتی۔۔۔ لیکن اسے دیکھ کر تمہاری نیت بدل گئی۔ وہ اب پہلے والی جوئی تو نہیں رہی تھی۔ کچھ تعلیم بھی حاصل کرلی تھی۔ معمولی سا اعتماد بھی آگیا تھا۔ پھر اس کا حسن بھی تمہاری نیند اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اسے دیکھ کر تمہاری مہربانیوں نے رنگ بدل لیے پھر تمہیں سلطانہ آپا بھی مل گئیں۔ مفت کی غلام، تمہارے اشارے پہ چلنے والی اور تم سدا کی مفاد پرست۔۔۔ تم نے جوئی کا پتا کاٹ دیا۔ سلطانہ آپا کو سامنے لے آئیں۔ تمہارے مفاد پرست ذہن نے اس ادھیڑ عمر عورت کی عزت کا بھی پاس نہیں رکھا۔ وہ بدصورت تھی، کم شکل تھی، تنہا تھی، بے آسرا تھی، بیوہ تھی، بانجھ تھی۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ تمہارے کام کی تھی۔۔۔ تم نے اسے میرے ساتھ نتھی کرنے کا سوچ لیا۔ مگر اس سے بھی پہلے اپنی بدزبانی سے جوئی کو اذیت کے کچوکے لگا لگا کر یہاں سے نکالنا چاہا۔ اسے کئی دفعہ میری غیر موجودگی میں گھر سے نکالا۔ تم سوچ رہی ہوتا۔۔۔ یہ سب مجھے کس نے بتایا؟ تو جزا کے لیے دل میں عناد نہ پالنا۔۔۔ مجھے یہ سب واجد صاحب نے بتایا۔۔۔ وہی واجد صاحب جنہوں نے یہ فائل بک بھیجی۔ یہ راز تو کھلنا ہی تھا۔ جوئی نہ بھی بتاتی تب بھی واجد صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دینا تھا۔ اس معذوری نے بھی تمہیں سبق نہیں دیا۔ تم جوئی سے خود کو افضل سمجھتی تھیں۔ اسے حقیر اور معمولی جانتی تھیں۔ اللہ نے تمہیں خود کی نظر میں حقیر کردیا۔ تمہیں لوگوں کا محتاج کردیا۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ تمہاری بے صبری تمہیں کہاں لے آئی؟ جزا کے صبر نے اسے کہاں تک پہنچا دیا۔۔۔ مما اور تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔"

ماہمن اس دن کو سوچتی جب فائل بک اس تک پہنچی تھی۔ وہ بھی ایک بے زار سا دن تھا۔ جب پوسٹ مین ڈاک دے کر گیا تھا۔ اس پر پاکستان کے ٹکٹ جان بوجھ کر لگائے گئے تھے۔

اسے امید تھی کہ مما نے جوئی کے لیے کچھ اور "سرپرائز" بھیجا ہوگا۔ مگر وہ "سرپرائز" تو سارے راز کھول گیا تھا۔ سارے ثبوت اپنے تئیں جلا دینے کے باوجود حقیقت کھل گئی تھی۔ حقیقت کو تو کھلنا ہی تھا۔ غفیوکی بدبختی، ماہمن کے حسد اور خود غرضی نے عمر بھر کے لیے انہیں عدل کی نگاہ میں ہلکا کردیا تھا۔

وہ سب اکٹھے رہتے تھے، ایک ساتھ بیٹھتے، ہنستے مسکراتے۔۔۔ وہ عدل تھا۔ اسے دونوں بیویوں میں عدل کرنا، توازن رکھنا آتا تھا۔ وہ اسے بھی وقت دیتا، آؤٹنگ پہ لے جاتا۔ ڈاکٹرز سے چیک اپ کرواتا، دوائیاں کھلاتا۔۔۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔

مگر جب بھی کبھی اس کے اندر دس سال پہلے والی ماہمن بیدار ہوتی۔ وہ بے چین ہو کر عدل کو میسج لکھنے لگتی تھی۔

"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔"

اس کا سوال، جواب کے انتظار میں سسکتا رہتا۔ عدل کی طرف سے کوئی جواب نہ آتا۔

ماہمن کے دل سے وہ آخری پھانس کبھی بھی نہیں نکلی تھی۔ اس رات جب جزا سالوں کے بند کھول رہی تھی۔ جب روشنی کی ہلکی لکیر عدل کی آنکھوں میں اتر کر سچ کو واضح کررہی تھی۔ تب عدل نے صرف ایک بات ماہمن کے لیے کہی تھی۔ صرف ایک بات، صرف چند الفاظ۔۔۔ عدل نے بہت تنفر اور حقارت سے کہا تھا۔

"دنیا میں رہنے کے لیے دو بہترین جگہیں ہیں۔ ایک کسی کے دل میں۔ ایک کسی کی دعا میں۔۔۔ تو جاؤ ماہمن! میرے دل سے اور جزا کی دعا کے حصار سے نکل کر کیسا محسوس کرو گی؟"

ماہمن کے دل سے ان لفظوں کی پھانس کبھی نہیں نکلی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ وہ عدل کے دل سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی ہے اور یہ احساس اس کے ہر عمل کی سزا کے لیے بہت کافی تھا۔